لاہ ہنیرا جہل بُرے دا چانن لا عقل دا ـــــ میاں محمد بخش

پاکستانی سیاست میں پنجاب مخالف رویے؟

عامر ریاض

ایڈیٹر عوامی جمہوری فورم

گذشتہ سالوں سے بالعموم اور چند سال سے بالخصوص پاکستانی سیاست میں پنجاب مخالفت کو میاں نواز شریف و مسلم لیگ (ن) کی مخالفت سے نتھی کر دیا گیا ہے۔ بڑے بڑے سورما بوجوہ اس کارِ خیر میں ملوث ہیں۔ 9/11 کے بعد کچھ گورے دانشوروں نے دہشت گردی کی مخالفت کو اسلام و مسلمانوں کی مخالفت سے نتھی کر دیا تھا اور "تہذیبوں کا تصادم" جیسے خیالات کی آڑ میں اپنا غصہ بھی نکالا اور مال بھی خوب کمایا۔ جب ہمارے ہاں طالبان مکاؤ پراجیکٹ شروع ہوا تھا تو کراچی کے کچھ اعلیٰ اذہان نے مذہبی بنیاد پرستی کی آڑ میں طالبان مکاؤ کو پختون مخالفت کی عینک ہی سے دیکھا تھا۔ ایسے ہی قیامِ پاکستان سے قبل جب 3 جون 1947 کے حوالے سے گفتگو آخری مراحل میں تھی تو آل انڈیا کانگرس نے قیامِ پاکستان کو تقسیم پنجاب و بنگال سے نتھی کر دیا تھا۔ یہ سب ایک ہی طرح کی سیاست ہے کہ نفی، تنگ نظر اور بغض پر مبنی سیاست مسائل کو سلجھانے کی بجائے مزید گنجلدار بنانے ہی کا باعث بنتی ہے۔

قیمت: 30 روپے

A Publication of Punjab Punch: A blog regarding Punjab and Punjabi. Http://punjabpunch.blogspot.com/

پاکستانی سیاست میں پنجاب مخالف رویے؟

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ پاکستان میں 65 سالوں بعد ہی سہی مگر پہلی دفعہ عوامی ووٹوں کے ذریعے منتخب قومی وصوبائی حکومتوں نے 5 سال پورے کیے۔ آئین میں قابل تحسین ترامیم کیں، متفقہ طور پر آزاد الیکشن کمیشن بھی بنایا اور اب ایک نگران حکومت کے ذریعے نئی جمہوری حکومتیں بننے جارہی ہیں۔ گو غیر جمہوری قوتوں کے ہاتھ بہت لمبے ہیں اور جمہوری تسلسل کو خراب کرنے کا بھی انہیں خاصا تجربہ ہے مگر اب جبکہ 11 مئی کی تاریخ الیکشن کے لیے مختص کر دی گئی ہے تو اس خوش فہمی میں مبتلا ہوا جاسکتا ہے کہ وطن عزیز پہلی دفعہ جمہوری تسلسل سے گزرے گا۔ البتہ جو کام ریٹرننگ افسروں نے دکھایا ہے اور جس باقاعدگی اور تواتر سے سیاستدانوں کے خلاف منفی تاثر پھیلانے کے عمل میں آزاد میڈیا کے ہرکارے ملوث ہیں اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کی مرکزیت پسند غیر منتخب اشرافیہ نے ہار نہیں مانی۔ بعض اعلیٰ اذہان سیاستدانوں پر تنقید کرتے ہوئے یہ دلیل بھی دیتے ہیں کہ اگر ضیاء الحق کی شامل کردہ شق 62 اور 63 اتنی ہی بری تھی تو پھر 18 ویں ترمیم کے وقت اسے نکال باہر کیوں نہیں کیا گیا۔ اگر اس وقت سیاستدان ایسا کر دیتے تو شاید یہ ترمیم منظور ہی نہ ہوتی۔ اس لیے سیاستدانوں نے بتدریج آگے بڑھنے کو شاید دانشمندی جانا۔ اس خدشہ کی حقیقت بارے ایس ایم ظفر نے 5 اپریل 2013 کی شام ایک ٹی وی انٹرویو میں تصدیق کی جو 18 ویں ترمیم کا ڈرافٹ تیار کرنے والی کمیٹی کے رکن تھے۔ ظاہر ہے حضرت نے غیر منتخب اشرافیہ کو تو بچانا تھا اس لیے الزام مذہبی انتہا پسندوں کے کھاتے ڈال دیا جو حالیہ فیشن کے عین مطابق ہے۔ ویسے بھی 62 اور 63 کی تلوار کو جس طرح آج کل میڈیا اور ریٹرننگ افسر بے دریغ

استعمال کر رہے ہیں اس کا ماضی میں اظہار نہیں کیا گیا تھا۔ اب اگر اس 62 اور 63 کی شق کو فوجی افسران، سول بیوروکریسی، جج صاحبان، میڈیا گروپوں کے مالکوں، اینکروں بینکروں اور صنعت کاروں پر بھی لاگو کر دیا جائے تو پھر ملکی نظم ونسق چلانے کے لیے ''فرشتے'' درآمد کرنے پڑیں گے۔ مطلب صاف ہے کہ پہلی دفعہ حقیقی معنوں میں بذریعہ ووٹ انتقال اقتدار کا جو کام ہو رہا ہے اس میں رکاوٹیں ڈالی جائیں۔ اسے کہتے ہیں کہ جے دُدھ دیناوی پے تاں مینگناں پا دیو۔ کہیں قوم اس جمہوریت کے بخار ہی میں مبتلا نہ ہو جائے یا ستدانوں کی تکریم نہ بڑھ جائے کہ اس کے لیے یہ سب کارروائیاں آئندہ حالات کا بندوبست بھی ہیں اور موجود لڑائی کا حصہ بھی جس میں غیر منتخب اشرافیہ ہر حال میں منتخب اشرافیہ پر اپنا بھار رکھنا چاہتی ہے۔ پنجاب کی لاہور ہائیکورٹ نے بروقت مداخلت تو کی ہے مگر ''میگنیاں'' تو ڈال ہی دی گئی ہیں۔ جمہوری تسلسل کے ساتھ ساتھ اور بھی کئی اہم مسائل ہیں جن سے ہماری غیر منتخب اشرافیہ کھیلتی ہی رہتی ہے۔ انہی اہم ترین مسائل میں سے ایک مسئلہ بارے یہ پنجابی بالعموم تینوں صوبوں اور بالخصوص پنجاب کے باسیوں سے اپنا دکھ سانجھا کرنا چاہتا ہے۔ یہ دکھ صرف پنجاب کا نہیں بلکہ اس کا ڈنگ پورے ملک کے لیے ازحد نقصان دہ ہے۔ یہ دکھ ہے، وطن عزیز میں مخصوص ذہنیت کے زیر اثر ''پنجاب مخالف سیاست'' کا پھیلاؤ۔ اس منفی سیاست کی جڑیں تاریخ میں بھی موجود ہیں مگر جس ہشیاری، مہارت اور ڈھٹائی سے ''پنجاب مخالفت'' کو گزشتہ 5 سالوں میں سیاسی قالب میں ڈھالا گیا ہے اس نے یہ تحریر لکھنے اور آپ سے اس دکھ کو سانجھا کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اک تازہ ترین مثال گیس اور بجلی کی لوڈشیڈنگ ہے کہ لاہور، فیصل آباد، گوجرانوالہ، راولپنڈی، سیالکوٹ اور گجرات میں تو نہ گیس (خصوصاً گاڑیوں اور کارخانوں میں) دستیاب ہوا اور نہ بجلی ملے مگر باقی صوبوں میں صورتحال یکسر مختلف رہے۔ سندھ میں گیس کی لوڈشیڈنگ ہفتہ میں ایک دن ہوتی ہے جبکہ پنجاب میں تین دن تو پھر بہت سے سوالات اٹھنے لازم ہیں۔ ان مسائل کو محض تکنیکی بنیادوں پر نہیں بلکہ سیاسی بنیادوں پر ہی درست کیا جاسکتا ہے۔ یہ لوڈشیڈنگ گزشتہ پانچ سالوں میں ضرورت سے زیادہ کی گئی اور اس کے لیے صوبہ بھی مخصوص تھا جس کے جواب میں پنجابیوں نے لاہور، فیصل آباد، سیالکوٹ، ملتان، گوجرانوالہ سمیت ہر شہر میں احتجاج کیا۔ یہ عجب دستور زمانہ ٹھہرا کہ خوفناک لوڈشیڈنگ انہی شہروں میں کی جاتی رہی جو بجلی، پانی وگیس کے بل ادا کرنے میں سب سے آگے رہے۔ اپنے اقبال مرزا نے تو مکدی گل کر ڈالی

کہ اگر پنجاب والے بھی بل ادا نہ کریں تو وہ بھی لوڈ شیڈنگ سے بچ سکتے ہیں۔ یہ بات تو بھی جانتے ہیں اور واپڈا کے اعداد وشمار بھی گواہ ہیں کہ بجلی کے بلوں کی ادائیگیاں کن صوبوں میں ہو رہی ہیں اور کہاں بجلی کو مالِ مفت سمجھ کر دلِ بے رحم کے حوالے کیا ہوا ہے۔

دوسری مثال دہشت گردی مخالف جنگ کی ہے جس میں مذہبی انتہا پسندی کو نشانۂ خاص بنایا گیا ہے۔ ہر کوئی کمر پر ہاتھ رکھ کر مذہبی انتہا پسندی و فرقہ واریت کے خلاف خود کو سیکولر کہلوانے پر کمر بستہ تو ہے مگر حال یہ ہے کہ ان 5 سالوں میں عدالتوں کے ذریعے کسی ایک قابل ذکر ملزم کو بھی مجرم ثابت نہیں کیا جا سکا۔ جہاں تفتیش کمزور ہو گی وہاں عدالتوں سے گلہ کرنا ''لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ'' کے سوا کچھ نہیں۔ البتہ یہاں بھی حسب روائیت نزلہ پنجاب پر ہی گرایا جاتا ہے۔ اگر پنجاب میں دہشت گردی یا فرقہ واریت کے واقعات کم ہوتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ پنجاب سرکار بالخصوص حکمران سیاسی پارٹی کے مخصوص مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے مذہبی انتہا پسندوں سے مراسم ہیں۔ اگر کہیں ایف آئی اے کی بلڈنگ کے تباہ ہو جانے جیسا واقعہ ہو یا بادامی باغ سانحہ برپا ہو جائے تو پھر کہا جاتا ہے کہ پنجاب سرکار میں تو اہلیت ہی نہیں، اسے فوراً ختم کر دینا چاہیے۔ اسے کہتے ہیں چٹ بھی اپنا اور پٹ بھی اپنا۔ ایسے دلائل نہ تو خیبر پی کے کے حوالے سے دیئے جاتے ہیں نہ ہی سندھ میں کوئی واقعہ ہو جائے تو حکومت کی برطرفی کی بات کی جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ جب ان صوبوں میں ایسے واقعات ہوتے ہیں تو اس کا الزام بھی پنجاب کے کھاتے ڈالنے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ کوئٹہ میں ہزارہ برادری اور کراچی میں عباس ٹاؤن کے سانحات کی تفتیش کی بجائے یہی روش حاوی رہی تھی۔ اس پیرائے میں میڈیا میں ہمنواؤں سے ایسے ایسے مضامین لکھوائے جاتے ہیں اور تبصرے نشر ہوتے ہیں کہ اصل مقصد واضح ہو جاتا ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ لکھاری یا تبصرہ نگار کا مقصد دہشت گردی یا فرقہ واریت کے خاتمہ کی بجائے ''سیاسی مخالفین'' کو نکرے لگانا ہی ہے۔ پہلے آپ پنجاب مخالف سیاست کا تاریخی پس منظر دیکھ لیں کہ اس کے بعد گذشتہ پانچ سالہ دور کے چیدہ چیدہ واقعات پر اک نظر ڈالتے ہیں۔

پنجاب مخالفت کا ماضی

پنجاب مخالفت ان بہت سے مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ ہے جو 1947 میں برٹش انڈیا

سے ورثہ میں ملے تھے۔ آل انڈیا کانگرس کی پنجاب مخالفت تو سمجھ میں آ سکتی ہے کہ پنجابیوں نے اس ''انقلابی'' جماعت کو کبھی گھاس ہی نہیں ڈالی۔ 1937 کے انتخابات میں پنجابیوں نے میاں فضل حسین اور چھوٹو رام کی یونینسٹ پارٹی آف پنجاب کو اکثریت سے نوازا تو 1946 میں آل انڈیا مسلم لیگ کو جوق در جوق ووٹ دیئے۔ 1946 کے انتخابات کے بعد برطانوی پارلیمنٹ نے کابینہ مشن بھیجا جس نے عرق ریزی سے ایک فارمولا بنایا۔ اس فارمولے کے تحت مرکز کو تین محکمے جبکہ صوبوں کو باقی سارے محکمے دیئے گئے تھے۔ قائداعظم نے اس فارمولے کو تسلیم کر لیا تو مرکزیت پسند کانگرس کو بھر تو پڑ گئے۔ اس فارمولے کے تحت پنجاب، سندھ، سرحد (خیبر پی کے) اور بلوچستان کو سیکشن اے میں اکٹھا رکھا تھا۔ پنڈت نہرو نے سرحد کے لیڈروں سے کہا آپ اس سیکشن میں شامل ہوئے تو پنجاب آپ کو کھا جائے گا۔ یہ بات حوالہ کے ساتھ جسونت سنگھ نے اپنی کتاب ''جناح: بھارت، تقسیم، آزادی'' میں چھاپی ہے[1]۔ یوں لگتا ہے جیسے ایک زمانے میں برطانیہ کے افسران زار روس سے خوفزدہ رہتے تھے اور انہیں روسیوں کا فوبیا ہوا ہوتا تھا ایسے ہی کانگرس بھی پنجاب کے فوبیا میں مبتلا رہی۔ ویسے جن انگریز افسروں نے روس کا بھوت تخلیق کیا تھا ان کا بڑا مقصد یہی تھا کہ اس بھوت کو کھڑا کر کے سرکار انگلشیہ سے خاصا مال بٹورا جائے۔ کانگرس میں بھی ایک ٹولہ ایسا تھا جو پنجاب کا فوبیا کھڑا کر کے اپنا اُلو سیدھا کرتا رہا۔ 1947 کے بعد اسی ٹولہ نے بھارت میں غدر مچایا جس کی تفصیل کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر و سینئر رہنما کانجی دوارکا داس نے اپنی کتاب ''آزادی کی طرف سفر'' میں دی ہے۔ کانجی صاحب نے آزادی کے بعد کا وہ واقعہ رقم کیا ہے جب اس ٹولہ نے اشیاء خورد و نوش کی قیمتوں کو بڑھانے کے لیے پنڈت نہرو پر بذریعہ مہاتما گاندھی دباؤ ڈالا کہ نہرو قیمتوں پر سرکاری کنٹرول کو ختم کریں۔ نہرو چند ماہ ہی یہ دباؤ سہہ سکے اور پھر عام چیزوں کی قیمتیں آسمانوں سے باتیں کرنے لگیں کہ اب ان پر سرکاری کنٹرول نہیں رہا تھا[2]۔ یہ ٹولہ کانگرس میں حاوی تھا کہ ٹاٹا اور برلا جیسے مالدار صنعت کار اس کے مربی تھے۔ بمبئی، گجرات وغیرہ کے سیٹھوں کا یہی وہ ٹولہ تھا جس نے مولانا آزاد کی رائے کو رد کرتے ہوئے کابینہ مشن کو مسترد کروایا تھا۔ اس ٹولہ کی پنجاب دشمنی کا مظہر 1947 میں کھل کر سامنے آ گیا

1- جناح: بھارت، تقسیم، آزادی۔ از جسونت سنگھ (انگریزی) مطبوعہ آکسفورڈ انڈیا 2010

2- آزادی کی طرف سفر: آخری 10 سال۔ (چشم دید گواہ کی کہانی) کانجی دوارکا داس پاپولر پبلشرز بمبئی 1968

کہ جب اس نے قیام پاکستان کے ساتھ تقسیم پنجاب کو نتھی کر دیا۔ تقسیم پنجاب نے اس خطہ پر وہ مہلک اثرات ڈالے کہ ان دھبوں کو بہت سی برساتیں بھی دھو نہ پائی ہیں۔ پنجاب دشمنی میں کانگرس کو یہ بھی خیال نہ آیا کہ مرنے اور بے گھر ہونے والے پنجابیوں میں محض پنجابی مسلمان ہی شامل نہیں بلکہ ہندو، سکھ، مسیحی، شیڈول کاسٹ سبھی پنجابی شامل تھے۔ امرتسر، جالندھر اور فیروز پور جیسے اضلاع میں تو مسلمان پنجابیوں کا تناسب 46 فیصد سے بھی زیادہ تھا جبکہ گرداس پور میں تو 1941 کی مردم شماری کے مطابق مسلمانوں کا تناسب 51.6 فیصد تھا۔ وہ یہاں تگڑے بھی تھے مگر انہیں بادل ناخواستہ اپنے اپنے اضلاع سے بے گھر ہونا پڑا۔ بہار سے مسلم لیگ کے رہنما اور قائداعظم کے ساتھی حسین امام نے خود ایک انٹرویو میں بتایا کہ جب قرارداد پاکستان کو ہم منظور کر رہے تھے تو ہمارے ذہن میں صوبوں کی تقسیم کا تصور بھی نہیں تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ پورا پنجاب ہمارے پاس ہوگا تو 2 کروڑ غیر مسلم پاکستان میں ہوں گے جبکہ 4 کروڑ مسلمان بھارت میں ہوں گے۔ یوں دونوں طرف اقلیتوں کا خیال رکھا جائے گا[1]۔ مگر بغض معاویہ میں کانگرس نے سارا زور تقسیم پنجاب و بنگال پر لگایا۔ کانگرس کی پنجاب دشمنی کا ایک ثبوت اپنے فیض احمد فیض بھی لائے تھے۔ یہ تین جون 1947 کے بعد کا واقعہ ہے کہ جب تقسیم پنجاب پر مہر ثبت ہو چکی تھی اور پنجاب باؤنڈری کمیشن کے ذریعے اس پر عملدرآمد ہونا تھا۔ فیض صاحب انگریزی کے مشہور اخبار ''پاکستان ٹائمز'' کے ایڈیٹر تھے کہ انہیں کانگرس کے عزائم بارے خبر ہو گئی۔ خبر کی تصدیق کے بعد 27 جون 1947 کے اخبار میں فیض صاحب نے ایک بصیرت افروز اداریہ لکھا۔ اداریہ میں اس خبر کا انکشاف کیا کہ جس کے تحت بھارت کے حصہ میں آنے والے پنجاب (مشرقی پنجاب) کو کانگرس پارٹی کے کرتا دھرتا مزید تین حصوں میں منقسم کرنے کا منصوبہ بنا چکے تھے[2]۔ مطلب وہ پنجاب کی تقسیم سے بھی راضی نہ ہوئے تھے بلکہ مزید تقسیم پر کمربستہ تھے۔ فیض صاحب کے بروقت اداریہ نے اثر دکھایا مگر پھر بھارت میں پنجاب کی مزید تقسیم پر 1966 میں عمل ہو ہی گیا اور بھارت کے حصہ میں آنے والے پنجاب کو 19 سال بعد ایک دفعہ پھر تقسیم کے عمل سے گذارتے ہوئے ہریانہ،

1- قائداعظم کے رفقاء سے ملاقاتیں از سید محمد ذوالقرنین زیدی الھماء، مطبوعہ قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت، اسلام آباد 1990

2- دیو پوائنٹ آن لائن کی اشاعت میں فاروق سلہریا نے یہ اداریہ مکمل چھاپ رکھا ہے۔ یہ رسالہ انٹرنیٹ پر دستیاب ہے۔

ہماچل پردیش اور پنجابی صوبہ میں تقسیم کر دیا گیا۔ خیر یہ تو ان کارناموں کا ذکر ہے جنہیں ہم ویسے ہی ''دشمن'' سمجھتے ہیں مگر اب یہ بھی دیکھ لیں کہ ہم نے اس ضمن میں اگست 1947 کے بعد کیا گل کھلائے۔

قیام پاکستان کے بعد پنجاب مخالفت کی ایک سے زیادہ صورتیں تھیں کہ جن میں کچھ تو ماضی کی سیاست کا ورثہ تھا جبکہ اب کراچی ''کانگرسی فلسفہ'' کو اپناتے ہوئے مرکزیت پسندی کا نیا حمایتی بن گیا تھا۔ کراچی کے نزدیک لاہور اور ڈھاکہ دونوں ہی ''بدعتی'' ٹھہرے۔ انگریز سرکار سے ورثے میں ملنے والے تحفوں میں سب سے ''نادر'' (اسے نادر شاہ درانی کے پیرائے میں پڑھیں تو زیادہ بہتر ہے) تحفہ آئی سی ایس افسران کی کھیپ تھی۔ تادم تحریر بھارت و پاکستان میں اس کھیپ کے انڈے بچے راج محلوں کی غلام گردشوں میں دندناتے پھرتے ہیں۔ ان آئی سی ایس افسران کا خمیر تحکم، جبر، عوام دشمنی اور اپنے مقاصد کے لیے گدھے کو باپ کہنے جیسے رویوں سے اٹھایا گیا تھا۔ سیاست سے انہیں چڑ تھی کہ سیاسی لیڈروں و سیاسی جماعتوں کو وہ اپنا حریف سمجھتے تھے۔ خوشامد اور بدعنوانی ہی نہیں بلکہ مذہب، فرقہ، زبان، قومیت، ذات برادری سبھی کو اپنے مقاصد کے لیے بروقت استعمال کرنے کی تربیت انہیں برٹش انڈین دور میں خوب مل چکی تھی۔ 1930 کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں جب 1935 کا ایکٹ آ رہا تھا تو ایک دن پنجاب یونینسٹ پارٹی کے روحِ رواں میاں سر فضل حسین نے فیروز خان نون، سر سکندر حیات، چھوٹو رام وغیرہ کو بلا کہا، دیکھو اب ووٹ کا زمانہ آ رہا ہے۔ اب ہمیں بھی بدلنا ہوگا اور پارٹی میں چھوٹے زمینداروں، کاروباریوں وغیرہ کو بھی شامل کرنا ہوگا[1]۔ سیاستدان تو ہوتا ہی وہ ہے جس کا زمانے کی نبض پر ہاتھ ہو مگر یہ آئی سی ایس افسر 1935 کے ایکٹ کے بعد ہی نہیں بلکہ بھارت پاکستان بننے کے بعد بھی بدلنے کو تیار نہیں تھے۔ البتہ ان میں بہت سے زیرک افسران نے کانگرس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں سے گٹھ جوڑ کر لیا تھا کہ بوقت ضرورت یہ کام آئیں گے۔

اختر حمید خان 1936 میں آئی سی ایس افسر بنے تھے مگر 1943 کے بعد جب انہیں بطور افسر بنگال میں دوران سیلاب و قحط کام کرنا پڑا تو آئی سی ایس افسران کی بدعنوانیوں کا ڈھیر دیکھ کر

1- میاں فضل حسین ایک سیاسی سوانح (انگریزی) از میاں عظیم حسین مطبوعہ لانگ مین گرین اینڈ کو لمیٹڈ، لندن 1946

انہوں نے نوکری ہی سے استعفیٰ دے ڈالا۔[1] یہ آئی سی ایس افسران کی فوج ظفر موج ہمیں ورثہ میں ملی تھی جو کراچی میں آکر براجمان ہوگئی۔ انگریز کے تربیت یافتہ آئی سی ایس افسران نے مرکزیت پسندی کو تگڑا کرنے کے لیے سیاست دانوں خصوصاً خان لیاقت علی خان کو بخوبی استعمال کیا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ تحریک پاکستان کی کامیابی کا 70 فیصد دارومدار پنجاب و بنگال کی حمایت پر تھا، اب یہ بات کی جانے لگی کہ پنجابی اور پختون تحریک پاکستان کے مخالف تھے، بلوچستان صوبہ ہی نہ تھا اور سندھ کا سیاست میں عمل دخل نہ ہونے کے برابر تھا، یعنی پاکستان مسلم اقلیتی صوبوں کے لوگوں نے بنایا ہے۔ ایک مارکسی و ترقی پسند محقق حمزہ علوی نے مسلم تنخواہ دار گروہ کے حوالے سے لکھے اپنے تحقیقی مضمون[2] میں یہاں تک لکھ مارا کہ پنجابی تو مسلم لیگ میں اس وقت شامل ہوئے تھے جب مسلم لیگ کی ٹرین چل پڑی تھی۔ اب ذرا آپ ہی بتائیں اگر ٹرین زوروں پر چل رہی ہو تو بھلا اس میں کیسے بیٹھا جا سکتا ہے۔ البتہ جو ٹرین ابھی چلنی شروع ہو اور سیٹیاں مار مار کر مسافروں کو مدعو کر رہی ہو اس میں بیٹھا جا سکتا ہے۔ 1937 کے انتخابات کے نتائج دیکھ لیں کہ مسلم لیگ کی کیا حالت تھی۔ جب پنجاب و بنگال نے ساتھ دیا تو مسلم لیگ میں جان پڑ گئی۔ مگر جہاں دانشوروں کی ترجیحات میں بھی پنجاب مخالفت ہی اولیت رکھتی ہو وہاں پھر تجزیہ مشکل ہو جاتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ آئی سی ایس افسران میں موجود مخصوص ''صاحبانِ من'' پر مشتمل گروہ کو ایسے طعنے دینے کا خیال 14 اگست کے بعد آیا اور کیوں یہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔ اب وہ پاکستان کے سیاہ و سفید کے مالک بننا چاہتے تھے مگر اس میں انہیں صوبوں سے مدافعت کا خدشہ تھا۔ یوں مرکزیت پسند پالیسیاں بنانے والوں نے اپنی حاکمیت کے لیے سندھ میں آنے والے مہاجروں کو استعمال کرنے کی ٹھان لی۔ اُردو اور اسلام کے حوالے سے ان مہاجروں کو استعمال کرنا بھی آسان تھا کہ یہ جن صوبوں سے بے گھر ہو کر آئے تھے وہاں ہندو اکثریت کو خوش کرنے کے لیے کانگرس نے ان کو عدم تحفظ کا شکار کر رکھا تھا۔ اُردو ہندی تنازعہ اور بندے ماترم جیسے مسلم دشمن ترانوں کے گرد ترتیب دی گئی سیاست نے انہیں اُردو اور اسلام کے قریب کر دیا تھا۔ اقلیتیں اگر عدم تحفظ کا شکار ہوں تو ان میں دو طرح کے رجحانات ہی کی گنجائش رہ جاتی ہے۔

1- اختر حمید خان: یادیں لشکارے (انگریزی) آکسفورڈ، پاکستان 2005

2- تشکیل پاکستان میں سماجی طاقتوں اور نظریات کا کردار، حمزہ علوی، اکنامک اینڈ پولیٹیکل ویکلی، 2002

وہ یا تو ہر زیادتی کو مقدر سمجھ کر بیٹھ جاتے ہیں یا پھر ردعمل میں ہر انہونی پر یقین صادق کے لیے کمر بستہ رہتے ہیں۔ جیسے یہ حقیقت دنیا بھر کی اقلیتوں پر منطبق کی جا سکتی ہے ایسے ہی مسلم اقلیتی صوبوں میں رہنے والے بھی اس سے مبرا نہیں تھے۔ 1947 میں یہ پاکستان آ گئے مگر تا حال یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ انہیں کراچی میں بسانے کی حکمت عملی کن اذہان نے بنائی تھی۔ عمومی طور پر اس کا الزام لیاقت علی خان پر لگتا ہے کہ وہ وزیر اعظم تھے مگر حالات و واقعات یہ چغلی کھاتے ہیں کہ اس کے پیچھے مرکزیت پسندی کی آڑ میں پاکستان کے سیاہ سفید کے مالک بننے کا خواب دیکھنے والے سول افسروں کا ہاتھ تھا۔ بس ان مہاجروں کو کہا گیا کہ پاکستان تو آپ نے بنایا تھا، باقی تو سب چلتی بس میں سوار ہو گئے تھے۔ مگر یہ دلیل حقیقت حال سے لگا نہ کھاتی تھی۔

1937 کے انتخابات میں مسلم لیگ پنجاب میں بری طرح ہار گئی تھی جبکہ بنگال میں مولوی اے کے فضل الحق کی کرشک پرجا پارٹی نے زیادہ نشستیں جیتی تھیں۔ اس وقت مسلم اقلیتی صوبوں میں مسلم لیگ کو مناسب ووٹ ملے تھے مگر ان صوبوں میں ان کا تناسب 8 تا 12 فیصد ہی تھا اس لیے وہ اسمبلیوں میں غیر موثر ہی رہے۔ 1937 کے انتخابات کے بعد قائداعظم نے پنڈت نہرو کے نام مفاہمت کے خطوط لکھے کہ اب مسلم لیگ اور کانگرس مل کر ملک کے مسائل حل کریں۔ مگر جواب میں پنڈت صاحب نے انہیں یاد دلایا کہ مسلم لیگ نہ پنجاب میں ہے اور نہ ہی بنگال میں تو پھر میں آپ کو مسلمانوں کا نمائندہ کیوں سمجھوں۔[1] قائداعظم نے مسلم لیگ کی شکست کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ اب انہیں پنجاب و بنگال پر توجہ دینی چاہیے۔ بات تھی بھی درست کہ مسلم لیگ کا حال بہت پتلا تھا کیونکہ 1937 کے انتخابات کے بعد کانگرس بس ماسوائے پنجاب و بنگال ہر جگہ آ گے آ گے تھی۔ بس قائداعظم نے نہ صرف اے کے فضل الحق کی بطور وزیر اعظم بنگال حمایت کر دی بلکہ پنجاب میں کانگرس کو شکست دینے والی یونینسٹ پارٹی آف پنجاب کے لیڈر سکندر حیات سے 1938 میں معاہدہ بھی کر لیا جسے ''جناح سکندر معاہدہ'' کہتے ہیں۔ یہ تھی وہ سیاسی بصیرت کہ جس کے بعد پنجاب کے دل لاہور میں 23 مارچ 1940 کو جلسہ کیا گیا۔ اس جلسہ کے لیے پنجاب و بنگال مسلم لیگ کے ساتھ تھے کہ اب مسلم لیگ کا ستارہ چمکنا شروع ہوا۔ 1940 کے تاریخی اجلاس کا وہ واقعہ تو سبھی کو یاد ہو گا جب قائداعظم تقریر کر رہے تھے تو پنڈال میں شیر بنگال اے کے فضل

1- تقسیم ہند: داستان یا حقیقت (انگریزی) از ایچ ایم سیروائی، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس پاکستان

الحق تشریف لائے۔ قائداعظمؒ نے محسوس کرلیا کہ لوگ ان کی تقریر کی بجائے شیر بنگال کی طرف متوجہ ہیں۔ انہوں نے فی البدیہہ وہ جملہ کہا جو صوبوں کے تگڑے کردار بارے قائداعظم کی بدل چکی سوچ کا غماز تھا۔ قائداعظم نے کہا، جب شیر آتا ہے تو میمنے کی آواز کون سنتا ہے۔ اگر یہ مذاق بھی ہو تب بھی اس میں وہ بصیرت ضرور موجود تھی جو کبھی اقبال نے جناح کو سجھائی تھی۔ قائداعظم کی سوانح لکھنے والے مشہور لکھاری ہیکٹر بولیتھو نے تو مطلوب الحسن سید کے حوالے سے قائداعظم کا جملہ بھی نقل کیا۔ مطلوب صاحب خود 23 مارچ کے اجلاس میں شریک تھے۔ اس اجلاس کے کچھ دن بعد قائداعظم نے ان سید صاحب سے کہا ''اقبال اگر آج زندہ ہوتے تو کتنے خوش ہوتے کہ ہم نے بالآخر وہی فیصلہ کیا جس کی انہیں آرزو تھی''۔[1]

آل انڈیا مسلم لیگ کی سیاست میں مسلم اکثریتی صوبوں کے حقوق کو اولیت دی جانے لگی کہ یہ وہی دوررس اور صاحب بصیرت مشورہ تھا جو علامہ محمد اقبال نے اپنے تاریخی خطبہ الٰہ آباد (1930) میں دیا تھا۔ علامہ اقبال نے تو خطبہ الٰہ آباد میں لکھا ہے کہ میں نے یہی تجویز نہرو کمیٹی (1928) کے روبرو بھی پیش کی تھی مگر انہوں نے اسے مسترد کردیا تھا۔[2] مسلم لیگ ماضی میں بھی صوبوں کے حقوق کی بات کرتی تھی مگر اب اس نے اسے اولیت دینی شروع کردی۔ سندھ کو بمبئی سے الگ کرنے کا مطالبہ ہو، صوبہ سرحد کو مکمل صوبائی حقوق دینے کی بات ہو یا بلوچستان کو صوبہ بنانے کی بات، یہ سب مطالبات قائداعظم کے 14 نکات میں بھی موجود تھے۔ یہ مطالبات کانگرس بھی کرتی تھی مگر ابھی تک صوبائی حقوق کے مسئلہ کو ان جماعتوں میں کلیدی حیثیت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ البتہ مسلم لیگ اور کانگرس میں ایک فرق بھی تھا۔ اس زمانے میں آئین میں دو فہرستیں ہوا کرتی تھیں۔ ایک صوبائی محکمے اور دوسرے مرکزی محکمے۔ کچھ محکمے ایسے ہوتے تھے جن کا تذکرہ ان دونوں فہرستوں میں نہیں ہوتا تھا۔ ان کو باقی ماندہ اثاثے (Residuary Resources) کہا جاتا تھا۔ کانگرس ان باقی ماندہ اثاثوں کو مرکز کو دینے کی حامی تھی جبکہ مسلم لیگ ان کو صوبوں کو دینا چاہتی تھی۔ اگر آپ نہرو رپورٹ اور قائداعظم کے 14 نکات کا موازنہ نہ کریں تو

1- محمد علی جناح ہیکٹر بولیتھو۔ اُردو ترجمہ زہیر صدیقی مطبوعہ اُردو سائنس بورڈ 2001

2- علامہ اقبال کی تحریریں، خطبات اور بیانات (انگریزی) مولف لطیف احمد شیروانی، پہلا ایڈیشن 1944، دوبارہ اشاعت 1978 اقبال اکیڈمی لاہور

یہ فرق صاف دیکھا جاسکتا ہے۔ یوں 1920 کی دہائی تک مسلم لیگ صوبوں کے حقوق کی بات بھی کرتی تھی مگر 1938 کے بعد اس کی سیاست کا گہوارہ مسلم اکثریتی صوبے بن گئے اور یوں وہ ان صوبوں کی منتخب قیادتوں کے بھی نزدیک ہوگئی۔ مگر اگست 1947 کے بعد بالعموم اور قائداعظم کی رحلت کے بعد بالخصوص وطن عزیز میں ایسا گروہ حاوی ہوتا گیا جو بوجوہ صوبوں کو تھلے لگانا اپنا فرض اولین سمجھتا تھا۔ مارچ 1949 میں قراردادِ مقاصد منظور کروانے سے قبل حسین شہید سہروردی کے ساتھ جو برتاؤ کیا گیا وہ مشرقی بنگال کو پیغام تھا جبکہ جو رویہ افتخار ممدوٹ کے ساتھ برتا گیا وہ پنجاب کے لیے پیغام تھا۔ بنگالی رہنما و سپیکر آئین ساز اسمبلی مولوی تمیز الدین خان نے مسلم بنگال کے ہردلعزیز رہنما حسین شہید سہروردی کی اسمبلی رکنیت ختم کردی تو لیاقت علی خان نے پنجاب حکومت توڑ ڈالی۔[1] یہ دونوں کام قراردادِ مقاصد منظور کروانے سے چند روز قبل کیے گئے۔ یہی نہیں پھر ''پروڈا'' جیسے قوانین بنائے گئے کہ جس کا مقصد اپنے سیاسی مخالفوں کے خلاف بدعنوانی کا ہتھیار استعمال کرنا تھا۔ قائداعظم اور علامہ اقبال کے خیالات کے برخلاف ایسی مرکزیت پسندی قائم کرنے کی ابتداء کی گئی جس میں پاکستانی مادری زبانوں، صوبائی خودمختاری اور مذہبی اقلیتوں کی جگہ تنگ کردی گئی تھی۔

لیاقت علی خان، سرظفر اللہ، مولانا شبیر احمد عثمانی، عبدالرب نشتر، خواجہ ناظم الدین، مولوی تمیز الدین وغیرہ تو قراردادِ مقاصد کو آئین کا حصہ بنانا چاہتے تھے مگر موچی دروازے کے غلام محمد نے بروقت مداخلت کر کے ایسا نہ ہونے دیا۔ لیاقت علی خان کے وزیر صنعت چوہدری نذیر احمد اور پہلی آئین ساز اسمبلی کے رکن عمر حیات ملک دونوں ہی چشم دید گواہ بھی تھے اور قراردادِ مقاصد کے حامی بھی۔ دونوں نے اپنے اپنے انٹرویوؤں میں غلام محمد پر اس حوالے سے شدید تنقید کی ہے۔ غلام محمد کا اصرار تھا کہ یہ لوگ ملک میں تھیوکریسی لانا چاہتے ہیں۔ اس لڑائی کے نتیجہ میں اک

1- حسین شہید سہروردی وفات سے قبل اپنی سوانح لکھ رہے تھے۔ 100 صفحات پر مشتمل نامکمل مسودہ بعدازاں 1987 میں چھاپا گیا۔ اسے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس پاکستان نے 2006 میں دوبارہ چھاپا ہے۔ صفحہ 112 پر سہروردی لکھتے ہیں، ''قائداعظم آئین ساز اسمبلی کے پہلے سپیکر بھی رہے اور ان کی حیات تک کسی نے میری اسمبلی رکنیت ختم کرنے کی بات کرنے کی بھی جرأت نہ کی۔ ان کی رحلت کے بعد یہ کھیل کھیلا گیا۔ 5 مارچ 1949 کو لیاقت علی خان نے سپیکر اسمبلی مولوی تمیز الدین خان کو کہا کہ میری رکنیت اسمبلی کو 26 فروری 1949 سے ختم کردیں۔''

سمجھوتہ کرنا پڑا کہ جس کے تحت قراردادِ مقاصد کو آئین کے دیباچہ میں رکھا گیا جو ایک درمیانی رستہ تھا۔[1] 1956، 1962 اور 1973 کے آئین میں اسی سمجھوتے کا پاس کیا گیا مگر پھر جنرل ضیاء الحق نے 8 ویں ترمیم کے ذریعے سب کچھ بدل دیا۔ تادم تحریر آزاد عدلیہ نے بھی اس بارے توجہ نہیں دی جو خود کو آئین کی روح کا محافظ کہتی ہیں۔

لیاقت علی خان کی پالیسیوں کے زخم خوردہ افتخار ممدوٹ اور حسین شہید سہروردی تھے۔ افتخار ممدوٹ کے والد شاہنواز ممدوٹ نے 23 مارچ 1940 کے جلسہ کی صدارت کی تھی جبکہ حسین شہید سہروردی تو مشرقی و مغربی پاکستان دونوں میں مقبول و محبوب تھے۔ اب دونوں کو جو دیس نکالا ملا تو دونوں نے پہلے جناح مسلم لیگ اور عوامی مسلم لیگ بنائی اور بعدازاں مل کر جناح عوامی مسلم لیگ بنائی۔ 10 تا 20 مارچ 1951 میں پنجاب میں پاکستان کا پہلا الیکشن ہوا۔ یہ صوبائی الیکشن بالغ رائے دہی کے اصول پر کروایا گیا تھا۔ اس میں جناح عوامی مسلم لیگ نے بھرپور حصہ لیا۔ اس الیکشن سے کچھ دیر پہلے ''پنڈی سازش کیس'' کے نام پر پنجاب کے ترقی پسندوں بشمول فیض احمد فیض پر وار بھی کیا گیا۔ بقول ایرک رحیم ہم نے کراچی میں سنا کہ لاہور اور پنڈی میں کمیونسٹوں کو

1- قراردادِ مقاصد کے حوالے سے یہ باتیں کتاب ''قائداعظم کے رفقاء سے ملاقاتیں'' میں موجود ہیں جسے 1990 میں اسلام آباد کے سرکاری ادارے ''قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت نے چھاپا تھا۔ اس کتاب کے مولف سید احمد ذوالقرنین زیدی الھما تھے جنہوں نے 1974 سے 1976 کے درمیان 13 ایسے لوگوں سے انٹرویو کیے جنہوں نے قائداعظم کے ساتھ ملاقاتیں کی تھیں۔ ان میں منٹگمری (ساہیوال) کے چوہدری نذیر احمد بھی تھے جو پنجاب مسلم لیگ کے ورکنگ کمیٹی کے بھی رکن تھے اور لیاقت علی خان کے مرکزی وزیر صنعت بھی۔ ان کا شمار ان مسلم لیگیوں میں ہوتا تھا جنہیں قائداعظم کی 11 اگست 1947 والی تقریر پر اعتراضات تھے۔ ان کے بقول غلام محمد اس قرارداد کے سخت مخالف تھے اور وہ حامی تھے۔ پھر اسمبلی میں قرارداد کے حوالے سے مسلم لیگ میں دو گروپ بن گئے تھے۔ ڈاکٹر عمر حیات ملک سرگودھا کے زمیندار خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کے رکن بھی تھے۔ پاکستان بننے کے بعد پنجاب یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر بنے۔ بعدازاں وہ پشاور یونیورسٹی میں بھی رہے اور بطور سفیر پاکستان کی نمائندگی کرتے رہے۔ ڈاکٹر عمر حیات ملک نے اپنے انٹرویو میں بتایا کہ وہ اور مولانا شبیر احمد عثمانی قرارداد کے حق میں تھے۔ اب وہ سر ظفر اللہ خان کا نام نہیں لے سکتے تھے حالانکہ انہوں نے بھی اسمبلی میں قرارداد کے حق میں لمبی تقریر فرمائی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کو غلام محمد پر بہت غصہ تھا کہ اس کی مداخلت کی وجہ سے سمجھوتہ کرنا پڑا اور قراردادِ مقاصد کو آئین کے دیباچہ میں رکھا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کی آرزو ضیاء الحق نے 1985 میں پوری کی جب اس نے 8 ویں ترمیم میں 1973 کے آئین کو بدل کر اس قرارداد کو آئین کا حصہ بنا ڈالا۔

پکڑا گیا ہے مگر یہاں کراچی میں گرفتاریاں نہیں ہوئی تھیں[1]۔ تاریخ پاکستان میں پہلی دفعہ الیکشن میں ''جھرلو'' کی اصطلاح سنی گئی۔ دھاندلیوں کے باوجود جناح عوامی مسلم لیگ نے 32 نشستیں جیت لیں۔ کراچی میں بیٹھے ہرکاروں نے ڈپٹی کمشنروں، کمشنروں اور پولیس کے ذریعے ''الیکشن چرانے'' کا بندوبست کیا کہ پنجاب میں افتخار ممدوٹ کی حکومت توڑنے کے بعد گورنر راج ہی چل رہا تھا۔ اس سب کا مقصد مرضی کے امیدواروں کو جتوانا تھا۔

پاکستان کی حکمران اشرافیہ کی اصل سردرد ملک میں بنگالی اکثریت کا وجود تھا۔ آئین کے پہلے دو ڈرافٹوں (1950 اور 1952) اور محمد علی فارمولا (1954) میں بھی بنگالی اکثریت سے نمٹنے کی کوششوں کو ہی اولیت حاصل تھی۔ دسمبر 1951 میں کراچی میں دوسری تعلیمی کانگرس کا ڈول ڈالا گیا۔ اس کانفرنس میں اُردو زبان کو پہلی دفعہ پاکستان کی واحد سرکاری زبان قرار دینے کی سفارش کی گئی۔ 1952 میں خواجہ ناظم الدین نے اس کا باقاعدہ اعلان کر دیا تو بنگالیوں نے بجا طور پر شور مچایا۔ قائداعظم نے تو 1948 کی تقاریر میں اُردو کو محض ''رابطہ کی زبان'' (Laigua Franca) کہا تھا جبکہ اسی تقریر میں انہوں نے کہا تھا کہ اگر آپ (مشرقی بنگال) کی اسمبلی صوبہ میں بنگالی زبان کو بطور سرکاری زبان کے اپنانا چاہتی ہے تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ مگر ہمارے ہاں علامہ اقبال اور قائداعظم کی تقاریر و بیانات کو توڑ مروڑ کر استعمال کرنے میں بیوروکریسی و حکمران خصوصی طور پر پیش پیش رہے۔ اس ردعمل کے نتیجہ میں 1954 میں محمد علی فارمولا آیا کہ جس نے ون یونٹ بنانے اور بنگالی کو اُردو کے ساتھ ساتھ دوسری قومی زبان قرار دینے کی بات کی۔ اس فارمولے کے پیچھے بھی وہی سوچ کارفرما تھی جس کا مقصد سب سے بڑے صوبہ کو نکیل ڈالنے کے سواء کچھ نہ تھا۔ درحقیقت کراچی میں براجمان سول ملٹری بیوروکریسی اور حکمران مرکزیت پسندی کے فلسفہ کے تحت ہر دم اپنی حکمرانی کو مضبوط کرنے ہی میں مگن رہتے تھے۔ 1954 ہی میں بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے برملا اُردو کو ''اسلامی زبان'' اور پاکستانی مادری زبانوں کو غیر اسلامی بھی کہہ

1- ایرک رحیم کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان (مغربی پاکستان) کے ساتھ وابستہ رہے۔ آج کل ایرک صاحب برطانیہ مقیم ہیں۔ 1948 سے 1956 تک وہ کراچی ہی رہے اور کمیونسٹ پارٹی کے دفتر ان کا آنا جانا رہتا تھا۔ عوامی جمہوری فورم کو انہوں نے ایک انٹرویو دیا تھا جسے کاشف بخاری نے لیا تھا۔ اس انٹرویو کو شمارہ نمبر 50 میں چھاپا گیا تھا جو آن لائن www.ajfpk.org پر بھی دستیاب ہے۔

ڈالا۔ یہی نہیں جب انہیں معلوم ہوا کہ بنگالی زبان کو بھی اُردو کے ساتھ تختِ شاہی پر جگہ دی جا رہی ہے تو موصوف نے کراچی میں مرکزی اسمبلی کے باہر ایک بڑا مجمع لگا لیا[1]۔ تاہم 1956 کے آئین میں بنگالی اور اُردو کو پاکستان کی دو قومی زبانیں تسلیم کر گیا۔ یہ فیصلہ درست تھا یا غلط، اس بارے بھی بات کریں گے۔ مگر جب دانشور بھی بیوروکریسی کی زبان بولنے لگیں تو پھر عام لوگوں کو الزام نہیں دینا چاہیے۔

اگر پاکستانی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو قراردادِ مقاصد (1949) سے لے کر 1971 تک پاکستانی حکمران اشرافیہ خصوصی طور پر اکثریتی صوبے سے خائف نظر آتے تھے۔ اسی ڈر سے انہوں نے 1956 تک آئین بھی نہ بنایا کہ پھر اکثریت کو اقتدار دینا پڑ جائے۔ 1956 میں آئین تو بن گیا مگر اس کے تحت اڑھائی سال بعد جب انتخابات ہونے لگے تو مارشل لاء کے ذریعے مرکزیت پسندی کے ایجنڈے کو آگے بڑھایا گیا۔ اکثریتی صوبے سے نمٹنے کی مہم 1971 میں پاکستان کے ٹوٹنے پر جا کر کچھ دیر کے لیے ختم ہوئی۔ جب بنگالی زبان کو اُردو کے ساتھ دوسری قومی زبان قرار دیا گیا تھا تو اس کا مطلب عوامی سطح پر یہی لیا گیا کہ جو بھی مادری زبان احتجاج کرے گی حکمران اس کو تخت پر بٹھا دیں گے۔ اس تاثر نے بعد ازاں پاکستان کی سیاست کو گھن کی طرح کھایا۔ یعنی اس فیصلہ سے ریاست کے کرتا دھرتاؤں نے از خود عام پاکستانیوں کو یہ تاثر دیا کہ سیدھی طرح، قانونی، آئینی انداز میں نہ تو آپ کے مسائل حل ہو سکتے ہیں نہ حقوق حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

16 دسمبر 1971 کے بعد پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو مرحوم اور ان کی پاکستان پیپلز پارٹی اقتدار میں آئی۔ 1970 کے انتخابات میں اس جماعت کو پنجاب ہی نے سب سے زیادہ ووٹ دیئے تھے۔ سرحد (خیبر پی کے) اور بلوچستان میں یہ نہ ہونے کے برابر تھی تو سندھ میں اس کی نشستیں حکومت سازی کے لیے کم تھیں۔ مگر پنجاب میں اس جماعت نے تمام پرانے ریکارڈ توڑ ڈالے۔ ذوالفقار علی بھٹو، سر شاہنواز کے فرزند تھے اور لاڑکانہ ان کا آبائی علاقہ تھا۔ اس کے

1- مشہور محقق خرم علی شفیق نے انٹرنیٹ پر ایک تحقیقی مضمون رکھا ہے جس میں 1947 سے لے کر 1977 تک پاکستان کے 50 برسوں میں ہونے والے اہم واقعات رکھے گئے ہیں۔ The Chronicle of Pakistan کے نام سے ان کے اس کام کو کراچی کے مشہور رسالے ہیرالڈ نے مکمل شمارے کی صورت چھاپا تھا جب پاکستان کی 50 ویں سالگرہ منائی جا رہی تھی۔ انٹرنیٹ پر اسے pakistanspace.tripod.com/chronicle میں دیکھا جا سکتا ہے۔ 1954 کی انٹری میں جو خبریں لگی ہیں ان میں بابائے اُردو کے جلسہ کی خبر بھی ہے۔

باوجود انہوں نے لاہور میں اپنی پارٹی بنا کر اپنی سیاسی بصیرت کا ثبوت پیش کیا تھا۔ پنجابیوں نے بھی انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا اور پیپلز پارٹی کے غیر معروف کارکنوں نے 1970 کے انتخابات میں بڑے بڑے جاگیرداروں و صنعت کاروں کو ہرا کر ایک الگ تاریخ رقم کی۔ پاکستان ٹوٹنے کے بعد اقتدار اسے ہی ملنا تھا جس کی مغربی پاکستان میں اکثریت تھی کہ یوں پیپلز پارٹی اقتدار میں آ گئی۔ اسٹیبلشمنٹ تو خوش تھی کہ چلو بنگالی اکثریت سے جان چھوٹ گئی، خس کم جہاں پاک۔ مگر 1972 کے بعد اب انہیں اور فکریں ستانے لگی تھیں۔ وہ یہ ماننے کو تیار نہیں تھے کہ مسلم لیگ کی حمایتیں کرنے والے فدائی بنگالی مسلمان درحقیقت غیر جمہوری طرز سیاست اور مرکزیت پسندی ہی کی وجہ سے پہلے مسلم لیگ پھر حکمرانوں اور بعد ازاں پاکستان ہی سے نالاں ہو گئے تھے۔ یہ ماننے کی بجائے بس سب کچھ ''ہندو سازش'' کے کھاتے میں ڈالا اور بعد ازاں کمال ہشیاری سے ذوالفقار علی بھٹو کو اس کا سب سے بڑا ذمہ دار قرار دلوانے کے لیے جت گئے۔ بھٹو صاحب نے اس مسئلہ پر حمود الرحمن کمیشن بنایا اور پھر مشہور محقق اور تاریخ دان کے کے عزیز کو اس کمیشن کی 39 جلدوں پر مشتمل رپورٹ پڑھنے کو دی۔ انہوں نے کتاب لکھ بھی لی مگر قدرت اللہ شہاب کی وجہ سے وہ کتاب چھپ نہ سکی[1]۔ بھٹو دور کے ابتدائی سالوں میں بیوروکریسی نے سیاست دانوں کے کندھوں کو استعمال کر کے صنعت، تعلیم کاروبار سب کچھ قومی تحویل میں لے لیا۔ یہ سب مرکزیت پسند سوچ ہی کا شاخسانہ تھا مگر نومولود پیپلز پارٹی اور اس کے رہنما اسے جمال عبدالناصر، قذافی اور ماؤ کی تقلید ہی سمجھتے رہے۔ پیپلز پارٹی کے نزدیک یہ انقلابی اقدامات تھے جبکہ بیوروکریسی اس سے اپنے مطلب پورے کرنا چاہتی تھی۔ جب تحقیق اور مکمل تیاری کے بغیر منصوبے شروع کیے جاتے ہیں تو اس سے عوامی مفاد کی بجائے بیوروکریسیاں ہی مستفید ہوتی ہیں۔ جب چھوٹی چھوٹی فیکٹریاں، کارخانے بھی قومی تحویل میں لیے جانے لگے تو پنجاب میں بھی پکار پڑ گئی۔ مگر پنجابی کیا کرتے کہ اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے بتوں کی پرستش کرنی ہی پڑتی ہے چاہے کتنے ہی طوفانوں کا سامنا ہو۔ دوسری طرف کراچی سے اسلام آباد منتقل ہو چکی اشرافیہ یہ تجزیہ کر چکی تھی کہ

1- یہ باتیں کے کے عزیز کی بیگم نے یک انٹرویو میں ریکارڈ کروائیں جسے بعد میں ''یادوں کا آنگن'' کے نام سے عوامی جمہوری فورم کے شمارہ نمبر 49 میں چھاپا گیا۔ یہ رسالہ فورم کی ویب سائٹ www.ajfpk.org پر گزشتہ شماروں کے خانے میں آن لائن دستیاب ہے۔

باقی ماندہ پاکستان میں دوبارہ سے اسے ایک اکثریتی صوبے ہی کا سامنا ہے۔ پاکستان کی آبادی میں بنگالیوں کا تناسب تو 52 فیصد تھا مگر اب موجودہ پاکستان میں پنجابیوں کا تناسب نہ صرف 56 فیصد تھا بلکہ ان کی بڑی تعداد سندھ، کوئٹہ، کشمیر میں تھی اور صوبہ سرحد (خیبر پی کے) میں تو ہندکو، ہزارہ وغیرہ کی شکل میں وہ ایبٹ آباد، مان سہرہ، ہری پور، کاغان، ڈیرہ اسماعیل خان سمیت بہت سے اضلاع میں اکثریت بھی رکھتے تھے۔ بنگالیوں کے برعکس یہ پنجابی نہ صرف پاکستان کے تمام باسیوں سے جڑے ہوئے تھے بلکہ ان کے سب سے تجارتی و ثقافتی رشتے بھی مضبوط تھے۔ اپنے متحرک سیاسی ماضی و موجودہ حالات کی وجہ سے پنجاب پاکستانی سیاست میں کلیدی کردار کا حامل تھا۔ حکمران جانتے تھے کہ انہیں وہی چیلنج کر سکتا ہے جس کے پاس پنجاب میں اکثریت ہوگی اور وہ پنجابیوں کا ہردلعزیز ہوگا۔ اب حکمرانوں کے لیے یہ بات اہم تھی کہ اس پنجابی اکثریت سے کیسے نمٹا جائے۔ ان کا مرنا یہ بھی تھا کہ خود حکمران پیپلز پارٹی کی طاقت کا قلعہ بھی یہی پنجاب تھا کہ اگر پیپلز پارٹی اور پنجاب اکٹھے رہے تو یہاں نہ صرف صوبے تگڑے ہوں گے بلکہ جمہوری بندوبست کو بھی ختم کرنا مشکل ہوگا۔ بات تھی بھی درست کہ پاکستانی سیاست دانوں نے 1973 کا آئین بناتے ہوئے صوبوں کو مزید توڑنے کا راستہ کٹھن کر کے صوبوں کی اہمیت کو تسلیم کر لیا تھا۔ آئین کی یہ شق مرکزیت پسندوں کو ایک آنکھ نہ بھائی کہ کراچی، اسلام آباد والے تو صوبوں کو پاؤں کی جوتی بھی نہیں سمجھتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ پاکستان میں پہلی دفعہ ریاستی سطح پر پاکستانی مادری زبانوں کو تسلیم کیا گیا اور سندھی، پشتو، پنجابی اور بلوچ و براہوی زبانوں کے اداروں کے لیے سرکاری فنڈز دینے بارے بھی فیصلے ہوئے۔ مگر یہ فیصلے مرکزیت پسند سوچ رکھنے والوں کو قطعاً پسند نہ آئے۔ انہوں نے سوچا کہ اگر یہ صوبوں کو تگڑا اور پاکستانی مادری زبانوں کو توانا کرنے پر کمربستہ ہیں تو ان کو نجل کرنے کے لیے ہمارے پاس اور بھی بہت سے ہتھیار ہیں۔ یوں سہ رخی پالیسی کا بیڑہ اٹھایا گیا۔ ایک طرف یہ کہا گیا کہ پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ تو پنجاب ہی ہے جبکہ دوسری طرف پیپلز پارٹی کو پنجاب سے اکھاڑنے کے منصوبے پر کام شروع کیا گیا تو تیسری طرف مادری زبانوں کے مسئلہ کو بے توقیر کرنے کے منصوبہ پر بھی غور شروع ہو گیا۔ اپنے تئیں وہ یہ سمجھتے تھے کہ پیپلز پارٹی اور پنجاب کے اتحاد کو ختم کرنے اور مادری زبانوں کے مسئلہ کو نجل کرنے کے لیے انہیں کسی بھی سطح تک جانا پڑا تو وہ گریز نہیں کریں گے۔ یہ سب عوام کی حکمرانی کے خلاف اقتدار کی

بھول بھلیوں میں کھیلا جانے والا وہ کھیل تھا جس کے تحت بھٹو حکومت کے زخم خوردہ گروہوں کو اکٹھا کیا جانے لگا۔ یقیناً پیپلز پارٹی نے بھی اپنے خلاف بہت سے مواقع خود پیدا کیے کہ جس ملک میں سیاسی و جمہوری بندوبست تسلسل سے جاری نہ ہو وہاں عقل کی ہر بات کی توقع ہمیشہ سیاستدانوں سے ہی کرنا کچھ جچتا نہیں۔

پیپلز پارٹی کو پنجاب سے بتدریج ختم کرنے اور پنجاب مخالف سیاست کو مخصوص مقاصد کے تحت بڑھاوا دینے کے ایجنڈے پر زیادہ یکسوئی اور منصوبہ بندی سے کام 5 جولائی 1977 کے بعد شروع کیا گیا کہ جب منتخب سیاسی قیادت کو ہٹا کر ملک میں ایک بار پھر طویل مارشل لاء نے قدم رنجا فرمایا۔ ضیاشاہی کا بیرونی ایجنڈا تو وہی تھا جس کا ایک شکار وہ خود 1988 میں بنا مگر ملکی سیاست میں اس کی ترجیحات میں یہ باتیں اہم تھیں۔

1- پیپلز پارٹی کو سندھی جماعت قرار دینا

2- کراچی میں لسانی تحریک کو ایسے بڑھاوا دینا کہ وہ کراچی میں رہنے والی دیگر قومیتوں میں عدم تحفظ کو بڑھادے۔

3- سندھیوں، بلوچوں اور پختونوں میں ایسے عناصر کو بھی براہ راست اور اکثر بلواسطہ مدد دینا جو صبح شام پنجاب و پنجابیوں کو گالیاں دیتے ہوئے ہر برائی کا کھرا لاہور میں ڈھونڈیں۔ یوں پنجاب بمقابلہ تین صوبوں کا نظریہ گھڑا گیا کہ سب لڑتے ہی رہیں۔

4- پنجاب میں پیپلز پارٹی کی جگہ پر نئی سیاسی قیادت و پارٹی کو ابھرنے میں مدد فراہم کرنا۔

5- پنجابی زبان کے لہجوں کو الگ الگ زبانیں بنانے کے منصوبہ کے پہلے مرحلہ پر پنجابی کے قدیمی لہجے لہندی کو سرائیکی قرار دے کر ایک ہی تیر سے پنجاب اور پاکستانی مادری زبانوں کے حمایتیوں کو سبق سکھانا۔

6- خصوصی طور پر یہ تاثر مضبوط کرنا کہ اسٹیبلشمنٹ تو پنجاب ہی کا دوسرا نام ہے۔ مطلب صاف تھا کہ لوگ سول ملٹری بیوروکریسی اور غیر منتخب اشرافیہ کی بجائے پنجاب کے دوالے رہیں۔

پنجاب اور کراچی میں کہا گیا کہ پیپلز پارٹی تو سندھیوں کی جماعت ہے اب آپ اپنی اپنی

جماعتیں کھڑی کریں۔ دوسری طرف پنجاب سے باہر خصوصاً سندھ میں یہ پروپیگنڈا کروایا گیا کہ بھٹو کو پنجاب نے مارا ہے کہ ضیاء الحق بھی پنجابی تھا اور جج بھی پنجابی تھے۔ درحقیقت وہ یہ چاہتے تھے بھٹو کے عدالتی قتل کا الزام سول ملٹری بیوروکریسی اور غیر منتخب اشرافیہ پر نہ لگے۔ ایسے میں وہ یہ بات نہیں کرنا چاہتے تھے کہ ضیاء الحق دور میں ہی بھٹو کی ضمانت بھی پنجاب کے لاہور ہائیکورٹ نے ہی لی تھی۔ ضیاشاہی کے خلاف پنجاب نے زبردست مزاحمت کی کہ پھر تحریک بحالی جمہوریت بھی لاہور ہی سے اٹھی تھی۔ پنجابیوں نے نہ صرف گرفتاریاں دیں بلکہ کوڑے بھی کھائے کہ ضیاشاہی جتنا دباتی تھی بھٹو کی محبت اتنی ہی بڑھتی جاتی تھی۔ اس سے گھبرا کر اپنے بظاہر ''انقلابی'' ساتھیوں کے ذریعے ایم آر ڈی کی تحریک کو سندھیوں کی تحریک ثابت کروانے کے لیے ضیاشاہی کے ہرکاروں نے مضامین بھی لکھوائے۔ جن صاحب نے یہ کارخیر سرانجام دیا انہوں نے بعد میں بہت ترقی کی اور عرصہ سے وہ سید صاحب ایک ختم ہوتی ہوئی سیاسی جماعت کے عہدیدار ہیں۔
ایک طرف کراچی میں لسانی سیاست کو ہوا دی گئی تو دوسری طرف سندھی، پختون، بلوچ قوم پرستوں میں ایسے عناصر گھسا دیے جن کا ایجنڈا محض پنجاب مخالفت ہی تھا۔ پنجاب میں نئی قیادت ابھارنے کی تیاریاں تھیں کہ اس کے امیدوار تو بہت تھے اس لیے فوری فیصلہ کرنے کی بجائے ایک سے زیادہ کھلاڑیوں پر سرمایہ کاری کی جانے لگی۔ پنجابیوں کی اکثریت کو قابو میں لانے کے لیے ضیاء الحق کے دور میں پنجابی زبان کو تقسیم کرنے کی راہ بھی دریافت کی گئی۔ مطلب یہی تھا کہ جب کبھی پنجاب بات نہ مانے تو اس کا بھی مناسب انتظام پہلے سے موجود ہو۔ سول ملٹری بیوروکریسی کو نہ تو سرائیکیوں سے مطلب تھا نہ کسی اور مادری زبان یا لہجہ سے انہیں پیار تھا۔ وہ تو ہر اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے پہلے سے اقدامات کرتے ہیں جو کل کلاں کو خطرناک ہوسکتا ہے۔
ضیاشاہی نے 1981 میں مردم شماری کروائی تو بغیر کسی بحث یا کسی مطالبہ کے پنجاب میں بولی جانے والی زبانوں میں پنجابی کے علاوہ سرائیکی کا خانہ بھی ڈلوا دیا۔ یاد رہے، پاکستان میں مادری زبانوں کے حوالے سے نیشنل عوامی پارٹی نے بھرپور سیاست کی تھی۔ پیدائش یعنی 1957 سے پابندی لگنے یعنی 1975 کے درمیان نیشنل عوامی پارٹی (NAP) کے ماہرین و قوم پرستوں کو یہ بات معلوم نہ ہوسکی کہ پنجاب میں سرائیکی نام کی کوئی چڑیا بھی ہے۔ جنوبی پنجاب کے تو بہت سے ترقی پسند بھی اس پارٹی میں شامل رہے۔ کم از کم 1975 تک انہیں بھی معلوم نہیں ہوسکا تھا کہ ان کی

زبان پنجابی نہیں بلکہ بدل چکی ہے۔ مادری زبانوں کی سیاست کرنے والی اس پارٹی کی ایک قرارداد بھی ایسی نہیں جس میں پنجاب میں پنجابی کے علاوہ کسی دوسری مادری زبان کی بات کی گئی ہو۔ جن اعلیٰ اذہان نے یہ قرعہ ضیاشاہی کے لیے دریافت کیا تھا انہیں معلوم تھا کہ پنجابی کا یہ لہجہ بولنے والے پنجاب ہی نہیں بلکہ سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد (خیبر پی کے) میں بھی موجود ہیں۔ یوں یہ بچہ جب جوان ہوگا تو سب صوبوں اور ان میں بولی جانے والی مادری زبانوں کی ناک میں دم کردے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو کے حمایتی بوجوہ اس کے اسیر ہوئے کہ یہ تصادم بڑھے گا تو اُردو کی تخت نشینی برقرار رہے گی۔ ایسے پروفیسر بھی تھے جنھوں نے جنوبی پنجاب میں ٹرانسفریں کروائیں اور ایجنڈے پر کام بھی کیا۔

یہی نہیں بلکہ صوبوں کو کمزور کرنے یا توڑنے کے حوالے سے بھی مرکزیت پسند گروہ کا ویژن واضح تھا۔ مرکزیت پسندی کے حوالے سے ضیاء الحق کا یہ بیان شہ سرخیوں سے اخبارات کی زینت بنا تھا جس میں انہوں نے پاکستان کو 100 صوبوں میں منقسم کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ پنجاب اور باقی تینوں صوبوں میں لڑائیاں کروانے کے لیے کالا باغ ڈیم کا شوشہ چھوڑا گیا۔ اس شوشہ کے حق اور مخالفت میں زوروشور سے بیانات داغنے و جلسے جلوس کروانے والے جانتے ہوئے یا انجانے میں ضیاء الحقی ایجنڈا کے لیے سرگرم عمل رہے۔ خان عبدالولی خان نے لاہور کے کسان ہال میں تقریر کرتے ہوئے خود یہ بات کہی تھی کہ بھلا میں یا پلیجو کالا باغ ڈیم کی تعمیر رکوا سکتے تھے؟ وہ تو ضیاء الحق خود ہی بنانا نہیں چاہتا تھا۔ اگر وہ بنانا چاہتا ہوتا تو بھلا فوج کے سربراہ اور صدر کو کون روک سکتا تھا۔ یہ آدھا سچ تھا جو خان صاحب نے بولا کہ وہ بوجوہ ''اندر کی بات'' نہ بتا پائے۔ اندر کی بات یہ تھی کہ ضیاء الحق نے یہ شوشہ صوبوں کو لڑانے کے لیے استعمال کیا تھا اور خود خان صاحب جیسے انقلابی ہی نہیں بلکہ دیگر ترقی پسند و قوم پرست بھی اس میں استعمال ہوئے۔

سیاسی سطح پر ''سندھی، پختون، بلوچ فرنٹ''، مہاجر قومی موومنٹ اور پنجابی پختون اتحاد جیسوں نے بھی ضیاء الحقی ایجنڈے کو کمال مہارت سے آگے بڑھایا۔ پیپلز پارٹی کو پنجاب سے اکھاڑنے کے لیے پنجاب میں بہت بڑی ''سرمایہ کاری'' تو کی گئی مگر 10 اپریل 1986 کے دن نے ضیاء الحقی ایجنڈے کی دھجیاں اڑا دیں۔ لاہور میں پنجابیوں نے جس طرح بھٹو کی بیٹی کا

استقبال کیا اس نے ضیاء الحق ہرکاروں کو چوکنا کر دیا۔ 1985 کے انتخابات کے بعد ایک سندھی محمد خان جونیجو کو کھڑا کیا گیا تھا کہ جسے پیر پگاڑا نے پیش کیا تھا مگر بعد ازاں پنجاب کے وزیر اعلیٰ میاں نواز شریف کو آگے لایا گیا۔ ضیاء الحق تو 1988 کے انتخابات سے قبل مر گیا مگر غلام اسحق خان موجود تھا جو اس کے مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں رُجھ گیا۔ میاں نواز شریف کو آگے کرنے والوں کو اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ اگر پنجابیوں نے واقعی میاں صاحب کو لیڈر مان لیا تو پھر مرکزیت پسند سول ملٹری بیوروکریسی سے ان کی بھی لڑائی ہو جائے گی۔ مگر فی الوقت تو انہیں بس شہید بینظیر بھٹو اور پیپلز پارٹی سے نمٹنا تھا۔ 1988 کے انتخابات نے ایک دفعہ پھر ثابت کر دیا کہ پنجاب مخالف ایجنڈوں کے باوجود پنجابیوں کی اکثریت پی پی پی کے ساتھ تھی۔ البتہ دوسری طرف اسلامی جمہوری اتحاد کے نام پر جو گروہ بنایا گیا تھا اسے ''پنجاب'' تحفہ میں دے دیا گیا۔ اس وقت تو سب دوست ہی پیپلز پارٹی اور بینظیر بھٹو کے حمایتی اور اسلامی جمہوری اتحاد کے مخالف تھے۔ مگر آج 2013 میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ محترمہ بینظیر بھٹو نے جو قابل تحسین اور بصیرتوں پر مبنی اقدام مئی 2006 میں ''میثاقِ جمہوریت'' پر میاں صاحب کو راضی کر کے کیا تھا، وہ اگر 1988 میں حکومت سنبھالنے کے بعد کر لیا جاتا تو ضیاء الحق ایجنڈے دم توڑ جاتے۔ اس دور میں تو مرکزیت پسند غیر منتخب اشرافیہ کا ایجنڈا یہی تھا کہ اگر جمہوریت بحال کرنی پڑ ہی گئی ہے تو سیاستدانوں کو لڑاؤ۔ ویسے آج کل بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے مگر اب 1988 کو دہرانا بہت مشکل ہے۔ 1988 میں محض پی پی پی تھی کہ جسے تجل کیا گیا جبکہ اب دو مقبول عام پارٹیاں وطن عزیز میں موجود ہیں جو جمہوریت کے لیے سرگرم عمل ہیں اور 1990 کی دہائی سے سبق سیکھ چکی ہیں۔ خیر یہاں بینظیر بھٹو کی پہلی حکومت کی بات ہو رہی تھی کہ جسے اگست 1990 میں غلام اسحق خان اور اسلم بیگ وغیرہ نے توڑ ڈالا۔ پھر 1990 کے انتخابات میں صدر غلام غلام اسحق خان کی زیر قیادت روئیداد خان، اجلال حیدر زیدی وغیرہ کے سیل نے پی پی پی کو ہرانے کے نئے ریکارڈ ترتیب دیئے۔ 1990 میں جب میاں نواز شریف نے حکومت سنبھالی تو حکومتی اتحاد میں وہ سب قوم پرست و لسانی جماعتیں شامل تھیں جن میں حاوی گروہ پنجاب مخالفت کے ایجنڈا پر عمل پیرا رہے تھے۔ بلوچستان کے غوث بخش بزنجو کی اولاد ہو یا فاضل راہو کے بیٹے، ایم کیو ایم ہو یا عوامی نیشنل پارٹی سبھی نے اس کار خیر میں حصہ ڈالا۔

1993 میں جب میاں نواز شریف کی حکومت کو بھی سول ملٹری بیوروکریسی ہضم نہ کر سکی اور اسے توڑ ڈالا گیا تو کسی نے یہ نہیں کہا کہ پختون صدر و چیف آف آرمی سٹاف نے یہ کام کیا ہے۔ یہ بھی کسی نے تبصرہ نہ کیا کہ ایک پنجابی وزیر اعظم کو ہٹایا گیا ہے۔ یہ تبصرہ اس لیے بھی نہ کیا گیا کہ اسٹیبلشمنٹ خود کو پنجابی کہہ کر مخالفتوں کا رخ اپنے بجائے پنجاب کی طرف ہی رکھنا چاہتی تھی جبکہ قوم پرست اس لیے یہ بات کہنے سے گریزاں رہے کہ ان کے پنجاب مخالف ایجنڈا کی بے توقیری ہوتی تھی۔ مگر دو بار میاں نواز شریف کی حکومت توڑنے اور انہیں سالہا سال جلاوطن رکھنے سے یہ بات طے ہو گئی کہ اسٹیبلشمنٹ تو صرف اپنی حکمرانی ہی چاہتی ہے اور اسے پاکستان میں مرکزیت پسندی کو بڑھاوا دینے کی پالیسی ہی کو چلانا ہے۔ بدعنوانی کے قصے ہوں یا پنجاب مخالف پروپیگنڈہ، یہ سب اسی ایجنڈے کو بڑھاوا دینے کے لاتعداد ہتھیاروں میں سے چند ایک ہیں۔ بینظیر بھٹو کی دوسری حکومت کو جب توڑا گیا تو پاکستان کے چیف جسٹس سجاد علی شاہ تھے۔ وہ سندھی بھی تھے اور ان کا انتخاب بینظیر بھٹو ہی نے کیا تھا۔ مگر جب انہوں نے سجاد علی شاہ کی عدالت میں اپنی حکومت توڑے جانے کے خلاف اپیل کی تو وہ مسترد کر دی گئی۔ یوں یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ جج ہوں یا جرنیل، جو اسلام آباد جا بیٹھتا ہے وہ بوجوہ مرکزیت پسند سول ملٹری بیوروکریسی ہی کے اشاروں کا اسیر ہو جاتا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے 2002 کے بعد محترمہ بینظیر بھٹو اور میاں نواز شریف نے ضرور سوچا ہو گا کہ اس بدلی ہوئی سوچ کا اظہار میثاقِ جمہوریت تھا جس پر دونوں نے 2006 میں دستخط کیے تھے۔ اس میثاق نے ایک دفعہ پھر ان کو ہلا کر رکھ دیا جو پاکستان میں مرکزیت پسندی اور غیر منتخب اشرافیہ کا راج دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ غیر منتخب مرکزیت پسند اشرافیہ افغان جہاد میں بھی آگے آگے تھی اور پھر طالبان مکاؤ پروگرام کے تحت دہشت گردی مخالف جنگ میں بھی پیش پیش رہی۔ ان دونوں واقعات کی وجہ سے انہوں نے اربوں ڈالر کمائے مگر پاکستان پر قرضوں کا بوجھ بڑھتا گیا۔ جنرل مشرف نے 12 اکتوبر 1999 کو آئین توڑ کر جس حکومت کو برخاست کیا تھا اس کے وزیر اعظم میاں نواز شریف تھے۔ جنرل صاحب تو 8 سال سے زائد عرصہ تک براجمان رہے مگر ان آٹھ سالوں میں میاں نواز شریف کی مقبولیت کا گراف بڑھتا رہا۔ یہ تھا 2008 کے انتخابات سے قبل کا منظر نامہ کہ اب گذشتہ 5 سالوں کی بات بھی ہو جائے۔

2008 کے انتخابات کے بعد کا پاکستان اور پنجاب مخالف رویے

انتخابات سے قبل محترمہ بینظیر بھٹو کی شہادت نے ملک کو جتنا نقصان پہنچایا اور اس زیرک سیاستدان کی عدم موجودگی میں جن ''سیاسی بونوں'' کو ابھرنے کا موقعہ ملا اس بارے آج اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ انہیں مارنے والوں نے اس دن کا انتظار کیا جب وہ پنجاب میں اپنی انتخابی مہم کا آغاز کرنے کو تیار تھیں۔ ان کو مارنے کے لیے پنجاب کے شہر راولپنڈی کا انتخاب بھی اسی ایجنڈے کی طرف اشارے کرتا ہے جو بعدازاں پانچ سالہ جمہوری دور میں ''تخت لاہور'' کو نشانہ خاص بنا کر چلایا گیا۔ گو کہ ابتداء میں آصف زرداری نے بینظیر بھٹو کی تقلید اور میثاق جمہوریت کی پاسداری میں جرأت مندی سے میاں نواز شریف کے ساتھ مل کر اتحادی حکومت قائم کی۔ پنجاب سے یوسف رضا گیلانی کا بطور وزیراعظم پاکستان متفقہ انتخاب بھی اس نئے تال میل کا امین تھا جو ہماری غیر منتخب مرکزیت پسند اشرافیہ کو قطعاً پسند نہیں آیا۔ یہ اتحاد جلد ٹوٹ گیا کہ جب ججوں کی بحالی کی دو دھاری تلوار کو بخوبی استعمال کیا گیا۔ یہ بات ہنوز راز ہے کہ جو اتحاد ججوں کی بحالی نہ ہونے کی وجہ سے ٹوٹا تھا وہ افتخار محمد چوہدری کی بطور چیف جسٹس بحالی کے بعد دوبارہ کیوں نہ بنایا جا سکا۔ یہ بھی درست ہے کہ مسلم لیگ (ن) کے مرکزی حکومت سے الگ ہو جانے کے بعد دونوں مقبول عام پارٹیوں میں ایسے ہرکارے کچھ زیادہ ہی متحرک ہو گئے تھے جو ہر حال میں تصادم کی راہ اپنانا چاہتے تھے۔ اس دوران پنجاب کی منتخب حکومت کو ہٹانے کی جو کوشش کی گئی وہ تصادم کی اس پالیسی کا شاخسانہ تھا کہ جس نے ایوانِ صدر کو متنازعہ بنا ڈالا۔ یہ درست ہے کہ پرویز مشرف کی چھٹی کروانے، 18ویں ترمیم کو منظور کروانے اور چیف الیکشن کمشنر بنانے جیسے متفقہ فیصلے ہونے کی وجہ سے دونوں مقبول عام پارٹیوں میں موجود تصادم بڑھانے والے ہرکاروں کو سخت دھچکے لگے کہ دونوں طرف کے زیرک سیاستدانوں اور خصوصاً لیڈرشپ نے نامساعد حالات کے باوجود یہ کام کر کے نیک نام کمایا۔ اس نیک کمائی کو رگیدنے کے لیے میڈیا اور سیاستدانوں کے مخصوص گروہوں کے ذریعے ''مک مکا'' کی اصطلاح کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا۔ تصادم کو اپنانے کی پالیسی کو اس وقت تقویت ملی کہ جب مسلم لیگ (ن) اور میاں نواز شریف کی مخالفت کو پنجاب مخالفت کے پیرائے میں رکھ کر تیر برسانے شروع کر دیئے گئے۔ یہ ایک انتہائی خطرناک سیاسی رجحان تھا اور اس کے ملک پر بہت مہلک اثرات پڑ رہے ہیں۔ ہمیں یاد ہے جب وطن عزیز میں

9/11 کے بعد طالبان مکاؤ پراجیکٹ شروع کیا گیا تو کراچی میں بیٹھے بہت سے ہرکاروں نے طالبان مخالفت کو پختون مخالفت کے پیرائے میں رکھ کر بیان کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ کراچی میں پختونوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور اثر سے بوجوہ خائف تھے اس لیے طالبان مکاؤ پراجیکٹ سے ان کی الفت کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ وہ اخبارات، کالموں، چینلوں اور بیانات کے ذریعے یہ تاثر دے رہے تھے کہ گویا ہر پختون یا قبائلی دہشت گرد و بنیاد پرست ہوتا ہے۔ پھر اس طالبان مکاؤ مہم کو خاص فرقہ وارانہ رنگ بھی دیا گیا کہ اب 9/11 کے بعد امریکہ و یورپ نے ''پرانے اتحادی'' سرد خانے میں رکھ کر ''نئے اتحادی'' رکھ لیے تھے۔ یہ تاثر دیا گیا کہ کچھ مسلم مکتبہ فکر بنیادی طور پر دہشت گرد ہیں جبکہ کچھ مسلم مکتبہ فکر لبرل ہیں۔ اسی پیرائے میں مسلم لیگ (ن) اور میاں نواز شریف کی مخالفت کو پنجاب بالخصوص وسطی پنجاب کی مخالفت سے جوڑ دیا گیا۔ پھر وہی پرانی فلمیں چلنے لگیں جن پر ضیاشاہی میں خاصا کام ہوا تھا۔ مگر اب ان فلموں کو منتخب سیاسی قیادت چلا رہی تھی کہ جس کے پاس نہ صرف بجلی، گیس کی لوڈشیڈنگ کی شکل میں جدید ہتھیار بھی تھے۔ بلکہ وہ تا حال پنجاب میں اچھی بھلی نشستیں رکھتی تھی۔ مگر پنجاب مخالف ایجنڈے نے اس پارٹی سے وابستہ پنجابیوں کو گم سم کر دیا۔ بھٹو نے جو پودا پنجاب کے مرکز لاہور میں لگایا تھا اسے اکھاڑنے کی کوششوں نے پارٹی کو بے توقیر بھی کیا اور بدنام بھی۔ سول ملٹری بیوروکریسی کو بھی پنجاب کو سبق سکھانے کا موقعہ ملا کہ نشانے وہ لگائیں گے اور الزام پاکستان پیپلز پارٹی پر لگے گا۔ بدنام پی پی پی، بھٹو اور بینظیر ہوں گے اور مال وہ کمائیں گے۔ تصادم میں ''مال'' بنتا بھی بہت ہے، بلکہ بے حساب۔ بس بڑوں کے وارے نیارے ہوئے۔ وفاق تو 18ویں ترمیم کے باوجود آج بھی کلیدی حیثیت رکھتا ہے کہ اس حمام میں میڈیا، غیر حکومتی ادارے، سول سوسائٹی سب پر خاص سرمایہ کاری کی گئی۔ حکومتی اتحاد میں موجود چھوٹی پارٹیوں کو بھی پنجاب سے پرانا حساب چکانے کا موقع ملا کہ ریلوے اور سمندر پار پاکستانیوں کی وزارت کے پنجاب میں موجود دفاتر کو اس مہم کے لیے بے دردی سے استعمال کیا گیا۔ وکلاء کے محاذ پر جو گل کھلائے گئے اور جس طرح کی غلیظ زبان استعمال کی گئی وہ اک الگ کہانی ہے کہ جس کے سب سے بڑے کردار کو پیپلز پارٹی نے بھی پہچان ہی لیا۔

یہ مسائل اپنی جگہ تھے کہ اب پنجاب کو تقسیم کرنے کی مہم کے ذریعے مسلم لیگ (ن) کو جنوبی پنجاب میں بے توقیر کرنے کی ٹھانی گئی۔ اس مہم میں سرائیکیوں کو استعمال کرنے کے سیاست پر

مہلک اثرات ہوئے۔ پاکستان پیپلز پارٹی تو کبھی پنجاب کا جھومر تھی اور اسے پنجاب سے بے دخل کرنے کے ضیاء الحق منصوبے ناکام رہے تھے مگر اب وہ اسی ضیاء الحق منصوبے کی خود اسیر ہو چکی تھی۔ مرکزیت پسند غیر منتخب اشرافیہ کو تو یہ دو دھاری تلوار بہت ہی من بھائی۔ اگر پی پی کامیاب ہو جائے گی تو پنجاب کو سبق سکھا دیا جائے گا اور اگر پی پی ناکام ہو گئی تو پنجاب سے کم از کم اس ناپاک پارٹی کا وجود ختم ہو جائے گا۔ جب یہ پنجاب میں نہ رہے گی تو پھر اسے سندھ کے چند اضلاع تک محدود کیا جائے گا۔ یوں مقبول عام سیاسی پارٹیوں میں سے ایک سے تو چھٹکارہ مل ہی سکتا ہے۔ اس کام کے لیے ملتان سے منتخب ہونے والے یوسف رضا گیلانی کا انتخاب مناسب تھا۔ گو گیلانی صاحب کا شمار جنوبی پنجاب کے انہی رہنماؤں میں ہوتا ہے جو ووٹ تو جنوبی پنجاب سے لیتے ہیں مگر جائیداد لاہور اور اسلام آباد ہی میں بناتے ہیں۔ اگر پی پی کو سرائیکیوں سے اتنی ہی محبت ہوتی تو وہ اپنے اتحادیوں کے ذریعے قومی اسمبلی اور سینیٹ میں کم از کم بحث کے لیے بل ہی لے آتی۔ مگر اس مسئلہ کو تو میاں صاحب کو سبق سکھانے کے لیے استعمال کرنا تھا نہ کہ مسئلہ کو حل کرنے کے لیے۔ اب سرائیکیوں کے دعویٰ کے مطابق تو ان کے اکثریتی اضلاع خیبر پی کے، بلوچستان اور سندھ میں بھی تھے مگر پی پی کی اس مہم میں بوجوہ ڈیرہ اسماعیل خان، نصیر آباد وغیرہ کو شامل نہ کیا گیا۔ اگر سندھ، بلوچستان یا خیبر پختونخواہ کے علاقوں کو شامل کرتے تو پھر ان صوبوں میں پکار پڑ جاتی۔ پھر پی پی کا اصل مسئلہ تو مسلم لیگ (ن) کو سبق سکھانا تھا اور اس مسئلہ پر (ن) لیگ کو بدنام کر کے جنوبی پنجاب سے الیکشن جیتنا تھا۔ مرکزی سول ملٹری بیوروکریسی بھی صرف پنجاب کو سبق سکھانا چاہتی تھی اس لیے بہت بحث کے بعد یہی قرعہ نکلا کہ مجوزہ نئے صوبہ کو پنجاب تک محدود رکھا جائے۔ یہی کام ماضی میں پاکستان نیشنل پارٹی (PNP)، عوامی نیشنل پارٹی (ANP) اور ترقی پسندوں کے کچھ گروہوں نے بھی کیا تھا۔ پی این پی کے بلوچ لیڈر تو ڈیرہ غازی خان اور راجن پور جیسے اضلاع کو بلوچستان میں شامل کرانا اور باقی جنوبی پنجاب کو الگ صوبہ بنانا چاہتے تھے۔ عوامی نیشنل پارٹی والے سرائیکی مسئلہ کو صرف پنجاب تک محدود رکھنا چاہتے تھے۔ ترقی پسندوں کے بعض گروہ تو بس اپنے اپنے گروپوں کو بڑھانے کے لیے ہر قسم کا مطالبہ بغیر سوچے سمجھے کرنے میں مشاق تھے۔ اسی طرح ایم کیو ایم پر الزام لگا کہ وہ پنجاب کو تقسیم کروا کر ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے ہیں۔ ایک طرف وہ پنجاب کو کمزور کریں گے تو دوسری طرف کراچی صوبہ کی

راہ خود بخود ہموار ہو جائے گی۔ جنوبی پنجاب کے نام سے الگ صوبہ بننے کے بعد کم از کم زخم خوردہ پنجاب تو کراچی صوبہ کے سلسلہ میں ان کی حمایت ضرور کرے گا۔ اس بات کو سندھی قوم پرستوں نے محسوس کیا اور بروقت جنوبی پنجاب کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا۔ ان تمام تر حربوں کے باوجود ان میں سے کسی کو بھی خاص کامیابی نہ ملی۔ جنوبی پنجاب والے بھی جانتے ہیں کہ انہیں کس کس طرح بار بار استعمال کرنے کے لیے نئے نئے جال بنائے جاتے ہیں۔ پی پی کا ایک مرنا یہ بھی تھا کہ وہ کالاباغ ڈیم کے مخالف تھی جبکہ کالاباغ ڈیم بننے سے جو نہریں نکلنی تھیں ان کا سب سے زیادہ فائدہ جنوبی پنجاب ہی کو ہونا تھا۔ ان نہروں سے جنوبی پنجاب کے کئی اضلاع میں پانی آ سکتا تھا جو ملکی زراعت میں کسی انقلاب سے کم نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سرائیکی تحریک والے بھی کالاباغ ڈیم کے حق میں بیانات دے چکے ہیں۔ اس لڑائی کو جب اتحادی جماعتوں نے بہت بڑھاوا دیا تو اس سے جنوبی پنجاب میں بسنے والے آبادکاروں و دیگر گروہوں میں بھی عدم تحفظ پیدا ہو گیا۔ یوں یہ مسئلہ جنوبی پنجاب کے پرامن ماحول پر بھی خطرناک اثرات ڈالنے لگا۔ پھر انتظامی و لسانی بنیادوں پر نئے صوبے بنانے کی بات ہونے گی۔

نئے صوبوں کی سیاست: انتظامی، لسانی بنیادیں یا نخجل پروگرام

پاکستان میں بہت سی قومیتیں ہی نہیں رہتیں بلکہ ان میں چھوٹے بڑے گروہ بھی ہیں۔ تاہم بالعموم 1973 کے متفقہ آئین کے بعد چار صوبوں کی حیثیت مستند سمجھی جاتی ہے۔ ان صوبوں میں بلوچستان رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑا صوبہ ہے تو آبادی کے لحاظ سے سب سے چھوٹا۔ اسی طرح پنجاب آبادی کے لحاظ سے ہی بڑا نہیں بلکہ تعلیم اور سہولتوں کے لحاظ سے بھی اس خطہ میں انگریز دور بلکہ اس سے پہلے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور سے تعلیم، تجارت اور زراعت کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ سندھ بلوچستان کو ساحل سمندر لگتا ہے تو خیبر پی کے اس پرانے سلک روٹ کی پٹی پر واقع ہے جہاں سے وسط ایشیا اور یورپ کو رستے جاتے ہیں۔ یاد رہے، برٹش انڈیا کے دور میں مرکزی حکومت تو نہ بنائی گئی البتہ 1918 کی چیمسفورڈ اصلاحات کے تحت صوبائی حکومتوں کو اختیارات بتدریج منتقل ہوتے گئے تھے۔ 1921 سے 1935 کے درمیان ان صوبوں میں تواتر سے محدود نمائندگی کے تحت انتخابات بھی ہوتے رہے کہ جس سے صوبائی اسمبلیاں بھی کام کرنے

لگیں تھیں۔ موجودہ پاکستان میں محض پنجاب ہی تھا جہاں 1882 سے پنجاب یونیورسٹی کام کر رہی تھی اور 1947 تک اردگرد کے صوبوں اور ریاستوں کی اکثریت یہیں پڑھنے آتی تھی۔ جبکہ چیمسفورڈ اصلاحات کے بعد یہاں مقامی سیاست پھلنے پھولنے لگی۔ سندھ کا معاملہ اس لیے خراب تھا کہ 1843 میں قبضہ کرنے کے بعد انگریز حاکموں نے اس سرزمین کو بمبئی کی ماتحتی میں دے دیا تھا۔ صوبہ سرحد کو ڈیورنڈ لائن معاہدہ (1894) کے بعد 1901 میں بنایا ہی کسی اور مقصد کے لیے تھا کہ یہاں کا گورنر وائسرائے انڈیا کی بجائے براہ راست تاج برطانیہ سے ہدایات لیتا تھا۔ مولوی محمد علی قصوری نے اپنی کتاب میں گورنر سرحد کے خصوصی اختیارات وفنڈ کا ذکر کیا ہے جو انتہائی اہمیت کا حامل ہے[1]۔ اس صوبہ کو بوجوہ محدود صوبائی اختیارات دیئے گئے تھے۔ بلوچستان صوبہ ہی نہ تھا۔ 1930 کے ابتدائی سالوں میں سندھ کو بمبئی سے آزادی ملی تو سرحد کو مکمل صوبائی اختیارات، مگر رہا وہ تاج برطانیہ کے خصوصی کنٹرول ہی میں۔ ڈیورنڈ لائن بندوبست کی حفاظت اور قبائلی علاقہ جات (فاٹا) کو برقرار رکھنا اہم ترین برٹش ہدف تھا جو تادم تحریر برقرار ہے۔ یہی وجہ تھی کہ 1947 تک صوبہ سرحد کی اسمبلی میں یورپین ممبران کا تناسب برٹش انڈیا کے کسی بھی صوبہ کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تھا۔ اب جب پاکستان بنا تو بلوچستان کوئٹہ ریذیڈنسی و ریاستوں میں منقسم جبکہ سندھ سرحد والے صوبائی حکومت کے محدود بندوبست کے ساتھ موجود تھے۔ مغربی پاکستان میں پنجابیوں کی اکثریت بھی تھی کہ وہ پنجاب ہی میں نہیں بلکہ سارے صوبوں میں پاکستان بننے سے پہلے سے موجود تھے۔ سندھ میں جب 1935 میں سکھر بیراج بنا تو وہاں کی زمینوں کو آباد کرنے بھی پنجابی ہی گئے تھے۔ اسی طرح کوئٹہ میں 1935 میں جو زلزلہ آیا تو پھر شہر کی تعمیر نو میں بھی پنجابیوں

1- قصور کے مولوی محمد علی قصوری (کینٹب) برطانیہ سے تعلیم لے کر آئے تھے اور پھر مولانا محمود الحسن اسیر مالٹا کے ساتھ رابطہ کی وجہ سے انہیں 1915 میں کابل بھیج دیا گیا۔ وہاں وہ کابل کے حبیبیہ کالج کے پرنسپل رہے۔ جب امان اللہ نے انگریزوں سے سمجھوتہ کر لیا تو پھر ان انقلابیوں کو افغانستان کے مفادات کی نگرانی کے لیے افغان حکومت کے ایماء پر قبائلی علاقہ جات بھیج دیا تھا۔ سیالکوٹ کے مولانا عبیداللہ سندھی تو انقلابی تھے، انہیں ریاستوں کے کاروبار سے کوئی سروکار نہیں تھا اس لیے وہ ماسکو کی طرف چل دیئے۔ مولانا قصوری نے پنجاب واپسی پر اپنے حالات وواقعات کے حوالے سے اک کتاب ''مشاہدات کابل و یاغستان'' لکھی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے یہ بتایا کہ گورنر سرحد کو ہدایات براہ راست برطانیہ سے ملتی تھیں اور وہ انہیں کو جوابدہ تھا نہ کہ وائسرائے انڈیا کو۔ یہ باتیں انہیں صاحبزادہ سر عبدالقیوم خان نے بتائی تھیں جو پولیٹیکل ایجنٹ سے لے کر وزیراعلیٰ صوبہ سرحد تک کے عہدوں پر فائز رہے تھے۔

نے بہت حصہ لیا تھا۔ اپنے چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کا خاندان بھی انہی دنوں کوئٹہ گیا تھا۔ 1973 کے آئین کے بننے کے بعد چاہیے تو یہ تھا کہ سیاست دان اب ان چار صوبوں کو بنانے کی طرف متوجہ ہوتے اور ان صوبوں میں جو بھی تاریخ کے کسی بھی دور میں آ بسے تھے انہیں ساتھ لے کر صوبوں کی ترقی میں رُجھ جاتے۔ صوبہ بننے کے بعد سب سے اہم کام بھی یہی ہوتے ہیں کہ اس کے ثمرات عام آدمی تک پہنچیں۔ مگر 1970 کی دہائی کے ابتدائی دور میں ایسا نہ ہو سکا۔ بلوچ رہنماؤں نے آتے ہی پنجابیوں کو نکالنے کا فیصلہ کیا تو سندھ میں اُردو سندھی جھگڑا کھڑا کر دیا گیا۔ رہی سہی کسر نیشنل عوامی پارٹی نے پوری کر دی کہ پیپلز پارٹی جیسی پارٹی سے اتحاد کرنے کی بجائے جمعیت علماء اسلام سے اتحاد کر لیا اور چند نشستیں جیتنے والے مولانا مفتی محمود مرحوم کو وزیراعلیٰ بھی بنا ڈالا۔ مولانا کا تو اپنا ایجنڈا تھا، انھوں نے تو اسے ہی مقدم رکھنا تھا۔ انھوں نے صوبہ سرحد میں جو مذہبی اقدامات اٹھائے تو خود کو سیکولر کہنے والوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ بس اس کھیل کا ڈراپ سین نیشنل عوامی پارٹی پر چلائے جانے والے مقدمہ کی صورت میں ہوا۔ یہ پارٹی اس وقت جمعیت علماء اسلام کے ساتھ مل کر صوبہ سرحد اور بلوچستان میں منتخب حکومت بنا کر بیٹھی تھی۔ نیپ اور بھٹو میں لڑائی نے صوبوں کے تگڑے ہونے کے عمل کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا۔ مرکزیت پسند غیر منتخب اشرافیہ تو کبھی بھی صوبوں کو تگڑا دیکھنے کے حق میں نہیں تھی اس لیے ان سے گلہ بنتا بھی نہیں۔ یوں یہ لڑائی نیپ اور پیپلز پارٹی تک محدود نہ رہی بلکہ بعدازاں اس نے بہت سے انڈے بچے دیئے۔ گو نیپ میں صوبہ سرحد و بلوچستان کی اکثریت تھی مگر یہ محدود سطح پر پنجاب و سندھ میں بھی تھے۔ روس چین جھگڑے اور پختون سیاست پر بے جا اسرار کی وجہ سے پنجابیوں اور سندھیوں کے موثر گروہ 1960 کی دہائی کے دوسرے نصف میں اس سے الگ ہو چکے تھے۔ اب دوران ''حیدرآباد سازش کیس'' اس پارٹی میں پختونوں اور بلوچوں میں بھی بوجوہ دوریاں بڑھ گئیں کہ بعدازاں بلوچ کبھی ان کے ساتھ ایک پارٹی میں نہ آئے۔ یوں عملاً یہ پختونوں کی پارٹی بن گئی مگر نہ تو سارے پختون اس کے ساتھ ہیں نہ ہی بلوچستان کے پختون اسے بوجوہ پسند کرتے ہیں۔ یوں صوبائی خودمختاری، مادری زبانوں اور ترقی پسندی کے دعویدار بھی ایسا حل نہ پیش کر سکے جس میں صوبوں کو تگڑا کرنے کا ویژن ہوتا۔ یہ تھا وہ پس منظر جس میں صوبوں کو لڑانا آسان بھی تھا اور ضیا شاہی میں اسے بطور موثر ہتھیار کے استعمال کیا گیا مگر اس میں اپنوں کی ستم ظریفیوں کا بھی بڑا

ہاتھ تھا۔ تاہم 2008 کے انتخابات کے بعد یہ صورتحال بہتر ہونی شروع ہوئی اور مرکز و صوبوں میں مقبول عام قیادتوں نے اقتدار سنبھالا۔ مگر جب نواز شریف مخالفت کو پنجاب مخالفت کے ساتھ جوڑ کر ایجنڈا چلایا گیا تو پرانی ٹیسیں اٹھنے لگیں اور گھبی دردیں یاد آ گئیں۔ یوں لگا کہ جو ضیاء الحق نہیں کر سکا تھا وہ یہ خود کرنے کو تیار ہیں۔ پنجاب میں نئے صوبہ کو بنانے سے جس کھیل کا آغاز ہوا وہ سیاسی ناعاقبت اندیشیوں، تعصبات اور من گھڑت تاریخی افسانوں کا ایسا بھنڈار ثابت ہوا جس میں سیاسی قیادتوں کی بے توقیری دیوار پر لکھی جا چکی تھی۔ ایم کیو ایم نے اے این پی کی دشمنی میں جنوبی پنجاب کے ساتھ ساتھ ہزارہ کو بھی صوبہ بنانے کی بات کی۔ پی پی پی، اے این پی اور ایم کیو ایم نے نواز شریف دشمنی میں سرائیکی صوبہ کی حمایت ایسے کی کہ جس میں سندھ، خیبر پی کے اور بلوچستان کے وہ اضلاع شامل نہ کیے جن کو سرائیکی تحریک والے اپنا حصہ کہتے تھے۔ یہ تلوار تو بنائی ہی پنجاب اور مسلم لیگ (ن) کے لیے تھی کہ اس دودھاری تلوار سے بچنے کے لیے میاں صاحب نے بہاولپور صوبہ کی بات کر دی۔ پہلے تو بحث اس بارے ہوتی رہی کہ نئے صوبے لسانی بنیادوں پر بنانے چاہئیں یا انتظامی بنیادوں پر۔ کچھ لوگوں کو تو لفظ لسانی ہی سے چڑ تھی کہ انہوں نے پاکستانی قوم پرستی کو اُردو اور ریاستی طاقت کو انگریزی سے نتھی کر رکھا تھا۔ جبکہ اصل صورتحال یہ تھی کہ پاکستان میں بولی جانے والی زبانوں کے حوالے سے حکومتی و غیر حکومتی سطح پر کبھی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی تھی۔ ایسی کوشش انہوں نے بھی نہیں کی تھی جو زبانوں کی سیاست کو اپنا اوڑھنا بچھونا قرار دیتے رہے تھے۔ بھارت میں 1948 میں جب آئین بننے لگا تھا تو ''ڈار کمیشن'' بنایا گیا تھا۔ اس کمیشن نے بھارتی آئین ساز اسمبلی کو رپورٹ پیش کر کے بتایا تھا کہ ملک میں 96 زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان میں 26 زبانیں ایسی ہیں جن کے بولنے والوں کی تعداد 5 ہزار سے زیادہ ہے۔ گو کہ 1950 کی دہائی میں اس رپورٹ کو بھارت میں مرکزیت پسند اشرافیہ نے منفی انداز میں استعمال کیا تھا۔ بھارتی آئین میں صوبوں کو توڑنے کا کلی اختیار مرکز کو دے دیا گیا تھا کہ جس کے تحت مرکز میں مضبوط حیثیت رکھنے والی پارٹی ان متصل اضلاع میں نیا صوبہ بنا ڈالتی تھی جہاں وہ کمزور ہوتی تھی۔ مگر ڈار کمیشن کے بعد کسی حد تک بھارتی مادری زبانوں کا مسئلہ حل ہو گیا تھا کہ ان 26 مادری زبانوں میں پرائمری تعلیم کے حق کو مان لیا گیا تھا۔ اب جب آپ کے پاس پاکستانی مادری زبانوں بارے کوئی تصفیہ ہی نہیں تو پھر لسانی بنیادوں کی بات کیوں؟ اب سرائیکی کا مسئلہ

ہی لے لیں کہ پنجابی زبان کے لہجوں کو اگر آپ الگ الگ زبانیں قرار دینے پر مصر ہیں تو اس کا فارمولا کیا ہے؟ یہ فارمولا پھر اردو سمیت ہر پاکستانی زبان کے لیے ہوگا۔ اب قبائلی علاقوں میں رہنے والے میرے محسود دوست یہ برملا کہتے ہیں پشتو کا جو لہجہ وہ بولتے ہیں وہ اصل پشتو ہے۔ مردان، چارسدہ والوں کی پشتو صحیح نہیں بلکہ اس پر پنجابیوں کا اثر ہے۔ بلوچستان کے کاکڑوں کا پشتو بارے اپنا خیال ہے۔ بلوچ اور براہوی زبانوں بارے تو سب کو اتفاق ہے جبکہ بلوچستان کے ساحلی علاقوں میں جو زبان بولی جاتی ہے اس میں ساحلی پٹی کا رنگ اس قدر غالب ہے کہ وہ اپنی انفرادیت بھی رکھتی ہے۔ تھر میں رہنے والے سندھیوں کا خیال ہے کہ لاڑکانہ کی سندھی زیادہ سخت ہے جبکہ دادو وغیرہ تک سندھی اور سرائیکی کو الگ الگ کرنا مشکل ہے۔ اب کراچی میں تو میمن گجراتی بولتے ہیں، برمی بنگالی بھی رہتے ہیں اور پاکستان کے چاروں صوبوں ہی سے نہیں بلکہ گلگت بلتستان اور کشمیر سے آنے والے بھی۔ یوں جب تک اس مسئلہ کو سمجھداری سے نہ دیکھا جائے تب تک اسے حل کرنا ممکن نہیں۔ حل بھی کیا جا سکتا ہے مگر نیت زبانوں کے مسئلہ کو حل کرنے کی ہونی چاہیے کہ جس سے پاکستان کی مضبوطی بھی نتھی ہو۔ مگر یہاں تو بس سیاسی ترجیحات ہیں یا پھر مرکزیت پسندی کی باتیں۔

اب ذرا انتظامی مسئلہ کی بات بھی کر لیتے ہیں کہ بڑے بڑے جگادری اس مسئلہ پر صفحات کالے کر چکے ہیں۔ جب ملک بنا تو پاکستان میں غالباً 9 ریاستیں اور چار صوبے تھے کہ بلوچستان، ابھی صوبہ نہیں بنا تھا۔ جب اکثریتی صوبے سے نمٹنے کا مسئلہ درپیش ہوا تو ون یونٹ بنا ڈالا۔ اس ون یونٹ کا ڈرافٹ اک بنگالی حسین شہید سہروردی نے لکھا تھا جبکہ مشرقی بنگال کی مقبول عام پارٹیوں کے اتحاد ''جگتو فرنٹ'' نے اسے قبول بھی کیا اور حکومت سازی میں گئے۔ 1969 میں جنرل یحییٰ خان نے اپنے اقتدار کو دوام دینے کے لیے ون یونٹ توڑ ڈالا کہ ہر نئی حکومت پرانی حکومت کے کیے کاموں کو رگیدنے کو ہی سیاسی کامیابی قرار دیتی رہی ہے۔ جس طرح بغیر دوراندیشی کے ون یونٹ محض فوری حل کے لیے بنایا گیا تھا اسی طرح اسے بغیر تیاری اور گہری سوچ بچار فوری مقاصد کے لیے توڑ ڈالا گیا۔ دوسری طرف کم از کم مغربی پاکستان میں کچھ ریاستوں کو ون یونٹ میں ضم کر دیا گیا تھا جبکہ باقی ریاستوں کو ون یونٹ توڑتے وقت صوبوں میں ضم کر دیا گیا۔ اسی طرح بلوچستان کو 1970 میں پاکستان کا صوبہ قرار دے دیا گیا۔ 16 دسمبر

1971 کے بعد جب مغربی پاکستان ہی پاکستان قرار پایا تو اس میں چار صوبے تھے اور ریاستیں ضم ہو چکی تھیں۔ اب انتظامی صوبے بنانے کے حامی یہ دلیل دیتے ہیں کہ صوبائی دارالحکومت سے دور اضلاع کے لیے سب سے زیادہ مشکل صورتحال ہوتی ہے۔ اس تمام تر دلیل کی نفی اس وقت ہو جاتی ہے جب عدم مرکزیت پر مبنی بلدیاتی نظام کو استوار کیا جائے۔ ہمارے ہاں 1947 کے وقت اک ماڑا موٹا بلدیاتی بندوبست موجود تھا۔ اس میں گو کہ منتخب قیادتوں کی بجائے ڈپٹی کمشنروں اور اسسٹنٹ کمشنروں کو زیادہ اختیارات حاصل تھے مگر علاقائی سطح کے بہت سے کام اس میں ہو جاتے تھے۔ مگر پھر ایوبی دور میں عدم مرکزیت کے فلسفہ کو فوجی اقتدار کو دوام بخشنے، صوبوں کو کمزور کرنے، سیاسی جماعتوں کو کمزور کرنے اور من پسند سیاسی قیادت پیدا کرنے کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ جنرل ایوب، جنرل ضیا اور جنرل مشرف میں قدر مشترک بھی یہی ہے کہ سبھی نے بلدیاتی بندوبست کو اپنے سیاسی دوام کے لیے خوب رگیدا۔ ایسے میں ایک طرف وہ سول بیوروکریسی سے اپنا حساب چکاتے رہے، صوبوں کو کمزور کرتے رہے اور ان اداروں سے من پسند نئی سیاسی قیادت پیدا کرتے رہے۔ اس نے سیاسی جماعتوں اور صوبوں کو بلدیاتی نظام بارے عدم تحفظ کا شکار رکھا۔ یہ بات مرکزیت پسند غیر منتخب اشرافیہ کو وارا کھاتی تھی کہ یوں بلدیاتی بندوبست یہاں وہ معتبری حاصل نہ کر سکا جو اسے یورپ، امریکہ میں حاصل ہے۔ جدید جمہوری بندوبست میں قومی، صوبائی بندوبست کے ساتھ ساتھ ضلعوں، تحصیلوں، یونین کونسلوں اور پنڈوں کی سطح پر منتخب جمہوری اداروں کی موجودگی میں ہی جمہوریت کے ثمرات عوام تک پہنچتے ہیں۔ اب ضیاء الحق کی خواہش کے مطابق 100 صوبے بنانے کا مطلب، یا 15,10 صوبے بنانے کا مطلب یہی ہے کہ یہ چار صوبے توڑ دیے جائیں یعنی مرکزیت پسندی اور مضبوط ہو۔ جبکہ 1973 کے آئین میں اس روش کو بھانپتے ہوئے، اس کا سد باب کر دیا گیا تھا۔ اگر موثر بلدیاتی بندوبست بنا دیا جاتا ہے تو عام آدمی کے زیادہ تر مسائل ان کے اضلاع ہی میں حل ہو سکتے ہیں۔ بلدیاتی بندوبست ایسا بنایا جائے جس سے نہ تو صوبے کمزور ہوں نہ ہی سیاسی عدم تحفظ بڑھے۔ سیاسی جماعتوں کو البتہ یہ اتفاق کر لینا چاہیے کہ بلدیاتی انتخابات تو سیاسی بنیادوں پر ہی ہوں مگر جو بھی کونسلر، میئر بنے وہ آئندہ بلدیاتی انتخابات تک اپنی پارٹی کی رکنیت کو معطل سمجھے۔ اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ بلدیاتی بندوبست کے ذریعے عام آدمی کے مسائل کو اولین ترجیح حاصل رہے۔ یوں بلدیاتی اداروں میں اچھی کارکردگی

دکھانے والے بھی کل کلاں کو صوبائی و قومی سطح پر اپنی اپنی پارٹیوں میں قیادت سنبھال سکتے ہیں۔ اب نئے صوبے بنانے کا مطلب تو اتنے ہی چیف سیکریٹری، سیکریٹری، وزیر، آئی جی وغیرہ وغیرہ ہے۔ ہماری غیر منتخب اشرافیہ کو تو یہ تجویز دل کو لگتی ہی ہے کہ ان کے وارے نیارے اس میں پہلے سے موجود ہیں۔ جہاں تک بڑے صوبوں کا مسئلہ ہے تو یہ دنیا کے کس ملک میں نہیں۔ کیا آپ جانتے ہیں امریکہ کی ریاست ٹیکساس کتنی بڑی ہے؟ اس کا امریکی سیاست میں عمل دخل بھی ہے۔ وہاں سے سیاسی پارٹی کا جیتنا بہت بڑی کامیابی متصور ہوتا ہے۔ مگر وہاں دیگر ادارے بھی کام کر رہے ہیں اور بلدیاتی بندوبست بھی ہے اس لیے بڑی ریاست یا صوبہ ہونے کے باوجود ایسے مسائل پیدا نہیں ہوتے۔ اب پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش جیسوں کا مسئلہ یہ بھی ہے کہ یہاں جمہوریت کو محض قومی، صوبائی اسمبلیوں تک ہی محدود رکھا ہوا ہے جبکہ بیوروکریسی اس کا تریاق نئے صوبوں میں ڈھونڈ کر سیاستدانوں و حکمرانوں کو خجل کرتی ہے۔ بھارت کی مثال سبق سیکھنے کے لیے کافی ہے۔

اس ساری بحث کا مقصد یہی باور کرانا ہے کہ نئے صوبوں کی بحث ہو یا لسانی و انتظامی تکرار، اس سب میں فوری مفاداتی سیاست کا رنگ غالب رہا کہ یہ عمل مرکزیت پسند غیر منتخب اشرافیہ کا بھی من پسند تھا۔ اس موقع پر میاں نواز شریف نے جب مرکزی سطح پر کمیشن بنانے کی بات کی تو وہ ایک واحد تجویز تھی جو مسئلہ کو حل کرنے کی طرف لے جانے کی طرف اک قدم تھا۔ دراصل میاں صاحب پر پہلے بھی اس مسئلہ کی وجہ سے دباؤ تھا کہ جب سے صوبہ سرحد کا نام خیر پختونخوا رکھا گیا تھا۔ اس وقت بھی میاں صاحب نے صوبہ کا نام ہزارہ پختونخوا رکھنے کی تجویز دی تھی۔ اب صوبہ سرحد میں پشاور سمیت کتنے ہی اضلاع ہیں جہاں پنجابی کے لہجے بولے جاتے ہیں جن میں ہندکو، پہاڑی، سرائیکی، گوجری سرفہرست ہیں۔ عوامی نیشنل پارٹی کو چاہیے تھا کہ وہ ان کے وجود کو مانتے ہوئے صوبہ کے لیے بہتر ویژن بناتی۔ مگر پارٹی میں حاوی تنگ نظر قوم پرست ماضی میں تو اس مسئلہ کے وجود ہی کو ماننے سے انکاری رہے اور جب پنجاب میں نئے صوبے کا پراجیکٹ چلانا تھا تو اس بارے منفی انداز میں فیصلہ کیا۔ یوں یہ مسئلہ متنازعہ ہی بنا رہا۔ موجودہ دور میں اے این پی نے اس مسئلہ کو منفی انداز میں حل کرتے ہوئے یہ کہا کہ صوبہ سرحد میں 24 زبانیں بولی جاتی ہیں۔ انہوں نے بغیر تحقیق و بحث کے پنجابی کے سارے لہجوں کو زبانیں قرار دلوا دیا کہ

جس کا مقصد صوبہ سرحد میں پنجابیوں کے تناسب کو کم کرنا تھا۔ اگر وہ گوجری، سرائیکی، پہاڑی، ہندکو بولنے والوں کو پنجابی مان لیتے تو پھر اسی تناسب سے ان کو حصہ دینے کی بات بھی ہوتی۔ دلچسپ تضاد یہ تھا کہ ایک طرف ڈیرہ غازی خان کی سب سے بڑی زبان سرائیکی ٹھہری تو دوسری طرف اس ضلع کو موجودہ سرائیکی صوبے یا جنوبی پنجاب کا حصہ بنانے سے بھی انکار تھا۔ جب میاں صاحب نے ہزارہ پختونخوا کا نام تجویز کیا تو میڈیا میں پکار پڑگئی۔ یہ کہا گیا کہ میاں صاحب تو ہر مسئلہ پر اڑی دکھاتے ہیں اور کسی مسئلہ کو حل کرنے میں ان کو دلچسپی نہیں ہے۔ بڑے بڑے دانشوروں نے بھی مخصوص ایجنڈے کے تحت یہی باتیں کیں۔ جبکہ حقیقت میں اگر اے این پی والے صوبہ کے مستقبل سے واقعی سنجیدہ ہوتے اور محض وقتی طور پر پنجاب یا پنجابی کی مخالفت کو مسئلہ نہ بناتے تو شاید یہ مسئلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حل ہو جاتا۔ ان علاقوں میں پنجابی تو ہمیشہ سے بستے تھے کہ ہزار سال پرانی کتب میں بھی ان بارے ذکر ہے۔ پختون باہر سے آئے تو ہیں مگر اب وہ بھی یہیں کے مقیم ہیں۔ ان میں ملاپ بھی ہے اور جھگڑے بھی، یہ تو ہر جگہ ہوتا ہے۔ سوات کے ہمارے دوست اور جہاندیدہ یوسف ذئی تاریخ دان سلطان روم بھی یہی کہتے ہیں کہ جنہیں ہم پختون کہتے ہیں وہ اس ملاپ ہی سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس حقیقت کو ماننے سے پختونخواہ کمزور نہیں ہوگا بلکہ ہزارہ کا لفظ لگنے سے وہ مکمل ہو جائے گا۔ فاٹا کا تو پتہ نہیں، وہ صوبہ کا حصہ بنتے ہیں یا نہیں مگر جو لوگ صوبہ میں صدیوں سے رہ رہے ہیں انہیں عدم تحفظ دینا کہاں کی سمجھداری ہے۔ بہت سے پختون بھی میری اس بات سے متفق ہیں۔ اب صوبہ کا نام خیبر پی کے رکھ دیا گیا اور میاں صاحب نے بھی بادل ناخواستہ اسے قبول کرلیا۔ مگر پھر وہی ہوا کہ حیدر زمان کے ذریعے ہزارہ صوبہ تحریک کے جلسے ہونے لگے۔ یوں انتظامی سطح پر جو حل نکالا گیا وہ عوامی یا سیاسی سطح پر تا حال متنازعہ ہے۔ پی پی پی کا خیال تھا وہ اسی طرح میاں صاحب کو پنجاب کی تقسیم پر بھی مجبور کرلیں گے مگر ہزارہ والے وار سے سبق سیکھ کر میاں صاحب نے ان کو بھی خجل کر ڈالا۔ مگر اصل بات وہی تھی کہ پاکستان کی بنیاد پر کمیشن بنایا جائے تو پھر عرق ریزی اور گہری سوچ بچار سے نئے صوبوں کے مسئلہ پر سیر حاصل بحث ہوگی۔ یہ بھی دیکھا جائے گا کہ اگر غربت کی بنیاد پر صوبے بنانے ہیں تو پاکستان کے کون کون سے متصل اضلاع میں غربت کا تناسب ایک حد سے زیادہ ہے۔ اگر آبادی کا معیار رکھنا ہے تو یہ دیکھا جائے گا کہ ملک بھر میں آبادی کہاں کہاں کتنی ہے۔ ایسے میں پی پی پی

کراچی کے رہنما اور مشہور دانشور پروفیسر کرار حسین کے صاحبزادے تاج حیدر کی رپورٹ بھی آ گئی۔ ان کا استدلال تھا کہ جنوبی پنجاب کو صوبہ بنانا اس لیے ضروری ہے کہ کیونکہ وہاں بہت غربت ہے۔ جبکہ ہزارہ میں غربت نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے حضرت کبھی ہزارہ گئے ہی نہ ہوں۔ یہ دلیل تو کبھی اے این پی والے بھی نہ دے سکتے تھے کہ وہ سرحد میں غریب اضلاع بارے جانتے ہیں۔ یہ سب پنجاب مخالفت کے مختلف سیاسی اظہار تھے۔ یہی ضیاء الحق کے دور میں بھی ہوا تھا مگر ایسے تمام ہتھکنڈوں کا عوام میں الٹا مطلب ہی سمجھا جاتا ہے۔

آخری بات

اس تمام تر بحث اور واقعات بیان کرنے کا مطلب اس کے سواء کچھ نہیں کہ ''پنجاب مخالفت'' ایجنڈے سے ہم دائروں میں تو گھوم سکتے ہیں، اپنے تعصبات، تفاخروں اور کج رویوں کو کسی حد تک مطمئن بھی کر سکتے ہیں مگر پاکستان میں بسنے والے کسی بھی صوبہ، مادری زبان یا عام آدمی کے مسائل کا حل اس نسخہ کیمیا میں نہیں۔ سوال یہ نہیں کہ آپ مادری زبانوں یا نئے صوبوں کی بات نہ کریں بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ انہیں جتنی جلد قومی سطح پر اتفاق سے حل کرلیں گے اس سے صوبوں کو بھی فائدہ ہوگا اور پاکستان بھی توانا ہوگا۔ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو جانے کتنی صدیوں سے اس خطہ میں پنجابی، پختون، بلوچ، سندھی اور کشمیری رہ رہے ہیں۔ انگریزوں کے آنے سے قبل آسٹریا کا اک سیاح برائن ہیوگل یہاں آیا تھا۔ اس کے بقول اس خطہ میں دریائی اور زمینی راستوں سے بھرپور تجارتیں ہورہی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ ٹھٹھہ کے نزدیک ''لہوری بندر'' بھی تھی کہ جہاں سے عرب و ایران کی طرف تجارتیں ہوتی تھیں۔ پانی اس خطہ میں وافر تھا کہ یہاں باہر سے آنے والوں کے لیے یہ ایک دلربا مقام تھا۔ یہاں غلہ بھی پیدا ہوتا تھا اور تجارتیں بھی تھیں۔ سونے پر سہاگہ یہاں صوفیا کے زریں اصولوں کا پھیلاؤ تھا جو مختلف مذاہب و قومیتوں کے لوگوں کو جوڑے رکھتا تھا۔ مگر اس بندوبست کو انگریز کے دور حکومت میں تہہ و بالا کر دیا گیا۔ 1809 میں جب چارلس میٹکاف لاہور میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ انگریزوں اور لہور دربار میں معاہدہ کرنے آیا تھا تو اس معاہدہ کی دوسری تجویز یہ تھی کہ پنجاب سرکار انگریزوں کی فوج کو اپنے علاقہ سے گزرنے کی جگہ بھی دے اور پنجاب میں عسکری ٹھکانے بھی بنانے دے تا کہ افغانستان کی

طرف لشکرکشی کی جائے۔ مگر مہاراجہ پنجاب نے کمال دوراندیشی سے انکار کر دیا تھا۔ اس کا مطلب تو یہی ہے کہ انگریز آج سے دوسو سال پہلے بھی افغانستان اور وسط ایشیا کی طرف جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے اس خطہ میں تجارتی سلسلوں کا رخ مار دھاڑ اور عسکری بھرتیوں کی طرف موڑ دیا۔ پھر 1894 میں ڈیورنڈ لائن بنا کر پرانے سلک روٹ کو بھی بند کر دیا گیا۔ یہاں ہندو مسلم، سکھ ہی نہیں بلکہ پنجابی، پختون، سندھی، بلوچ جھگڑے بڑھانے میں بھی ان کا خاصا کردار رہا ہے۔ اب وہ تو یہاں سے جا چکے ہیں مگر ان کی پالیسیوں کو جاری رکھنے والے یہاں اب بھی بہت ہیں۔ سونے پر سہاگہ مرکزیت پسندی نے چڑھایا کہ جس نے لسانی، قومیتی، ثقافتی رنگارنگی کو پاکستانی قوم پرستی سے بوجوہ متصادم کر دیا۔ اس تصادم کی سیاست کا نتیجہ یہ ہے کہ یہاں سبھی ایک دوسرے کی نفی میں اپنا تفاخر ڈھونڈنے میں غلطاں ہیں۔ پنجاب مخالف سیاست بھی انہی میں سے ایک اہم مسئلہ ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا ہم آج بھی اس کو جاری رکھنا چاہتے ہیں؟ یہ سوال آپ کے لیے چھوڑتے ہوئے یہ مضمون یہیں بند کرتے ہیں کہ میاں محمد بخش کے جس شعر سے اس کو شروع کیا تھا اس پر اسے بند کرتا ہوں۔

لاہ ہنیرا جہل بُرے دا چانن لاعقل دا ـــــ میاں محمد بخش

8-اپریل 2013، لہور

عامر ریاض پنجابی، اردو اور انگریزی زبانوں میں گذشتہ کئی برسوں سے لکھ رہے ہیں۔ تاریخ پنجاب، تاریخ پاک وہند، بین الاقوامی وپنجابی جدید ادب کے حوالے سے بطور پبلشر پنجابی، اردو اور انگریزی میں بہت سی کتب بھی چھاپ چکے ہیں اور بطور ایڈیٹر 2003 سے عوامی جمہوری فورم بھی وابستہ ہیں۔ یہ رسالہ بائیں بازو میں نئی سوچ اور ماضی کی سیاست کو از سر نو دیکھنے کے حوالے سے اپنی حیثیت منوا چکا ہے۔ اس کے تمام شمارے www.ajfpk.org پر آن لائن دستیاب ہیں۔ عامر گاہے بگاہے مین سٹریم میڈیا میں بھی لکھتے رہتے ہیں اور متبادل میڈیا کے ذریعے بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ دی نیوز، پاکستان ٹوڈے، ڈیلی ٹائمز، روزنامہ ایکسپریس اور روزنامہ دنیا میں ان کے مضامین چھپتے رہتے ہیں۔ پنجابی کی مشہور آن لائن ویب سائٹ www,wichaar.com پر عامر پنجابی میں تواتر سے لکھ رہے ہیں۔

تعلیم اور نصابی کتب کے حوالے سے ان کی تحقیقی رپورٹ ''ہم اپنے بچوں کو کیا پڑھا رہے ہیں! نصابی کتب بارے اک جائزہ'' کو ہر سطح پر سراہا جا چکا ہے۔

آج کل عامر ''پنجاب تے انگریزاں قبضہ کیوں کیتا'' کے عنوان سے اپنی پہلی کتاب پر کام کر رہے ہیں۔ یہ کتاب پنجابی زبان میں چھپے گی۔ پنجاب کے حوالے سے وہ ایک بلاگ Punjab Punch چلا رہے ہیں ان سے اس ای میل پر رابطہ کیا جا سکتا ہے۔ aamirriaz1966@gmail.com

انگریزاں پنجاب تے قبضہ کیوں کیتا؟

عامر ریاض

29 مارچ 1849 نوں انگریزاں پنجاب تے قبضہ کیتا سی۔ اوہ 50 ورہیاں توں ایس دِن نوں اڈیک رہے سن۔ اوہ لہور دربار دی حکومت نوں مکاون لئی کیوں اُتاولے ہورہے سن؟ اوہناں نوں کابل تے اس توں پراں جاون دی کیوں چھیتی سی؟ ایہہ کہانی پنجابیاں نوں ہی نہیں سگوں پختوناں، سندھیاں، بلوچاں اتے کشمیریاں نوں وی چیتے رکھنی لوڑی دی ہے۔

کتاب وِچ پڑھو:

پہلی گل

1- خطہ پنجاب: مغلاں ویلے تیک

2- دریائی، سمندری تے زمینی رستیاں دی اہمیتاں تے پنجاب

3- وڈی پادشاہتاں توں جغرافیائی پادشاہتاں اتے قومی ریاستاں ول سفر اتے قوم پرستی دے نویں اظہار

4- 18 ویں صدی دا پنجاب اتے بدلدی سیاستاں

5- رنجیت سنگھ تے پنجاب

6- انگریزاں دی پالیسی: بدلدی لوڑاں اتے نویں سیاست

چھیتی آ رہی ہے

پنجاب پنچ

A Publication of Punjab Punch: A blog regarding Punjab and Punjabi. Http://punjabpunch.blogspot.com/